BANAT- E- KHADEEJATUL KUBRA



مجلہ بنات خدیجۃ الکبریٰ

10

- غزہ کی خواتین : مزاحمت واستقامت کی بے نظیر مثال
- اسلام میں صنفِ نازک کی رعایت!
- جہاد سے روگردانی

1447 Rabi ul Awwal

2025 August

فہرست مضامین

اداریہ

فوجی آپریشنز اور قبائلی خواتین

حال ہی میں قبائلی علاقوں، خصوصا باجوڑ میں آپریشنز کی خبریں سامنے آ رہی ہیں۔ آئے روز کرفیو لگائے جا رہے ہیں، نقل مکانیاں ہورہی ہیں اور اسی طرح متاثرین کے حوالے سے دیگر مختلف خبریں سامنے آ رہی ہیں۔ جرگے اور وفود کی آمد و رفت اور احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے لیکن کوئی حل نہیں نکل آیا۔ اس سب میں ایک چیز جو تقریبا نظر انداز کی گئی وہ متاثرہ خواتین کے مسائل ہیں کہ انہیں ایسے میں کن مشکل حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

قبائلی معاشرہ چونکہ خواتین کے پردے کے لیے مشہور ہے تو ایسے حالات میں سفر کرنا، کیمپوں کے ناقص رہائشی انتظامات اور آج کل کے سوشل میڈیا کے دور میں ویڈیوز کے شوق کے باعث ان خواتین کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
اسی طرح علاج معالجے کا سیٹ اپ بگڑنے اور کیمپوں میں ہسپتال نہ ہونے کے باعث وہاں موجود خواتین کو مختلف طبی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، ولادت جیسے بڑے مسائل بھی عام طور پیش آتے رہتے ہیں، بچوں کے امراض الگ سے اور متاثرین میں بزرگ خواتین کی موجودگی بھی خود ان کیلئے اوران کے اہلخانہ کیلئے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔
گھر کے کام کاج اور اس معاشرے میں جہاں بچوں کو سنبھالنا سو فیصد خواتین کا کام ہوتا ہے، بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

اسی طرح ان علاقوں میں بچیوں کیلئے بڑھائی کا کوئی خاص انتظام موجود نہیں ہوتا تو جیسے تیسے کرکے بچیوں کو چھوٹے اسکولوں اور مدارس میں پڑھایا جاتا ہے، تو نقل مکانی کی وجہ سے وہ نظام بھی بگڑجاتا ہے۔
اس کے علاوہ کچھ خواتین گھر کا معاشی نظام چلانے کیلئے سلائی کا کام کرتی ہیں، گھر کی ضروریات جیسے دودھ، انڈے، مرغیاں اور کپڑے وغیرہ فروخت کرتی ہیں تو وہ کام بھی متاثر ہوجاتا ہے۔
پھر ظاہر ہے کہ ایک بار پورا علاقہ خالی ہو اور کچھ عرصہ بعد لوگ اگرچہ واپس اپنے علاقوں کو لوٹ بھی جائیں تو ان کی صورتحال بدتر ہو ہی جاتی ہے اور دوبارہ اپنے مقام پر آنے کیلئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔

تو کرفیو لگانے والے، اس سلسلے میں فوج کی معاونت کرنے والے علاقائی حکام و دیگر ذمہ داران کو ایسے احکامات نافذ کرتے وقت سو بار سوچنا چاہیے کہ وہ پوری قوم کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ صنف نازک کو طبی، معاشی، تعلیمی اور گھریلوں مسائل کا شکار بنا دیتے ہیں۔

غزہ کی خواتین : مزاحمت و استقامت کی بے نظیر مثال

بنت قمر

اکتوبر 2023 کو "طوفان الاقصی" کے نام سے جو مزاحمت کی جنگ حماس مجاہدین نے شروع کی، وہ آج تک جاری ہے۔ ہم اہلِ غزہ کو ایک مضبوط چٹان کی مانند کھڑا دیکھ رہے ہیں، جو نہ گھبرائے، نہ ڈرے، نہ بھاگے۔ حق و باطل کے اس معرکے میں فاتح کون ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

مرد تو مرد، ان کے بچے اور خواتین بھی عزم و استقلال کے ساتھ سینہ تان کر کھڑی ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، اللہ نے اہلِ غزہ کو کس مٹی سے بنایا ہوگا۔ سب کچھ لٹا کر بھی لب پہ حرفِ شکایت نہیں، ایک فاتح مسکراہٹ سب کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے۔

غزہ وہ خطہ زمین ہے جو مسلسل ظلم، محاصرے اور بمباری کی آگ میں جل رہا ہے، مگر اس ظلمت میں جو چراغ سب سے روشن ہے، وہ ہیں غزہ کی خواتین، استقامت و مزاحمت کی بے نظیر مثال۔ صیہونی طواغیت کے سامنے ایک ایسی چٹان بن کر کھڑی ہیں کہ ظلم کا ہر وار بھربھری ریت ثابت ہو رہا ہے۔

غزہ کی خاتون، جو ماں بھی ہے اور مجاہدہ بھی، اپنے بچے کو بہادری کی لوریاں سناتی ہے۔ شہادت کا مفہوم اپنے بچوں کو گود میں ہی سکھاتی ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کل اسے بھی باطل کے مقابل آنا ہے۔ وہ محصور ضرور ہے، لیکن مرعوب نہیں۔

ملبے کے ڈھیر سے زندگی کشید کرنے والی یہ عالی عزم خواتین، تعلیم، مزاحمت اور خدمت ہر میدان میں آپ کو اگلی صفوں میں نظر آئیں گی۔ وہ صرف مظلوم نہیں بلکہ استقامت کی چٹان ہیں، زخمی لیکن صبر کا منہ زور سمندر ہیں، عزیمت کا پہاڑ ہیں۔

غزہ کی خواتین کی بہادری اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی سطح پر بھی نمایاں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال بہادر فاطمۃ الزق ہیں، جنہیں اسرائیلی جیل میں اس وقت قید کیا گیا جب وہ حاملہ تھیں۔ انہوں نے یوسف کو جیل میں ہی جنم دیا۔ جیل میں پیدا ہونے والا وہ معصوم یوسف چند دن قبل اسرائیلی حملے میں شہید ہوگیا، مگر وہ ماں آج بھی استقامت کی اعلیٰ مثال بن کر کھڑی ہے۔

اس نے نہ کوئی رونا دھونا کیا، نہ بال نوچے، نہ ہی روتے دھوتے کفریہ کلمے کہے۔

اس کی ایک اور مثال مشہور فلسطینی ماں، جنہیں "ام نضال" کہا جاتا ہے، ہیں۔ انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو شہادت کے لیے نہ صرف تیار کیا، بلکہ اپنے تینوں بیٹوں کو قربان کرکے بھی وہ پرعزم ہیں، جبکہ وہ خود فلسطینی پارلیمنٹ کی رکن ہیں۔

ایک نوعمر لڑکی، امل، جو شدید زخمی حالت میں بھی کہتی رہی:

"ہم فلسطینی ہیں، ہم نہیں ڈرتے"۔

یہ چند مثالیں ہیں، جبکہ غزہ کی سرزمین ایسی لاتعداد مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مزاحمت، حوصلے اور ایثار کی ہر کہانی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ عورت گھر کے اندر اور اپنی شرعی حدود میں رہتے ہوئے بھی صرف ایک مدرسہ نہیں، بلکہ پوری ایک قوم کی معلمہ ہے۔ قوم کے لیے محافظ، رہنما اور قربانی کی عظیم مثال ہے۔

یہ ایک پیغام ہے کہ

"خواتین اگر بیدار ہو جائیں تو ظلم کے طوفان کا رخ موڑ سکتی ہیں، نسلوں کو سنوار سکتی ہیں!"

فریضہ جہاد، ایک دینی فکری اور عملی تقاضے

ام ریان

فریضہ جہاد کے مقاصد میں سے دو اہم مقاصد ہیں :

۱۔کفر کی شان و شوکت کو توڑنا

۲۔اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنا

یہ فریضہ چار مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ احکام جہاد کے یہ چار مراحل ہیں :

پہلا مرحلہ :

مکی دور میں مسلمانوں کو صبر کا حکم دیا گیا، کیونکہ اس وقت وہ تعداد میں کم اور کمزور حالت میں تھے، اوران کے پاس کوئی مرکزیت نہیں تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

خُذِ العَفْوَ وَامُرْ بِالعُرْفِ وَاعْرِضْ عَنِ الجاھِلِیْنَ"

عفو و درگزر سے کام لیجئے، بھلائی کا حکم کرتے رہیے، جاہلوں سے اعراض کیجئے ۔

دوسرا مرحلہ :

ہجرت کے بعد، مسلمانوں کو دفاعی راہ اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔

"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ"

(اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو (لڑنے کی)، جن پر (ناحق) ظلم کیا گیا، اور بے شک اللہ اُن کی مدد پر یقیناً قادر ہے)۔

تیسرا مرحلہ :

یہاں جہاد فرض کیا گیا، مگر صرف اس وقت جب دشمن حملہ آور ہو۔

چوتھا مرحلہ :

آخری مرحلے میں اقدامی جہاد کا حکم آیا :

"قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ" (التوبة: ٢٩)۔

ساری دنیا کے مسلمان ان چار مراحل میں سے کسی نہ کسی مرحلے میں داخل ہیں۔ لہذا، جہاد کی فرضیت سے انکار کرنا یا اس کی تاویل کرنا اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کا انکار ہے۔

جب اللہ کے حکم کی نافرمانی کی جا رہی ہو اور اسے نافرمانی بھی نہیں سمجھا جا رہا ہو، تو یہ ایک خطرناک صورت حال ہے، جو کفر کا سبب بن سکتی ہے۔

بہت سے لوگ خیر کے کاموں کو، جو کہ نفل یا مستحب کے درجے میں ہیں، جہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ یاد رکھیں، جب تک ہم اس غلط فہمی سے نہیں نکلیں گے، اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر فرد خود کو اس اعلیٰ مقصد کے لیے تیار کرے۔

1. اپنی شخصیت کی تعمیر خود کرے، خود کو جہاد کے لیے ہر لحاظ سے تیار رکھے، اس طرح کہ اس کا جسم توانا ہو، اخلاق محکم ہوں، فکر پختہ اور متوازن ہو، عقیدہ درست ہو، عبادتیں بے لوث ہوں، اسلام کی ترقی کے لیے کوشاں ہو، اور اپنے اوقات کی قدر کرے۔

2. اس کے سارے معاملات منظم اور شریعت کے پابند ہوں، اور اس کا وجود دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو۔ یہ فرداً فرداً سب کی ذمہ داری ہے۔

ہمیں اس بات کی دعوت دینی چاہیے، جس طرح بھی ممکن ہو سکے، کہ امت کو اس فریضہ کے لیے بیدار کرنے میں ہی امت کی بقا پوشیدہ ہے۔

داعی کی مثال کاشتکار کی مانند ہے : وہ کپاس بوتا ہے تو بونے سے پہلے زمین کو خوب تیار کرتا ہے، فصل تیار ہونے لگتی ہے تو گھاس پھوس صاف کرتا ہے، جڑوں کو لگ جانے والے کیڑوں سے بچاتا ہے، اور

پتوں و پھولوں پر حملہ آور ہونے والے حشرات سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ فصل کے تیار ہونے کی مدت کے دوران کاشتکار صبر و تحمل کے ساتھ اپنے کام میں جتا رہتا ہے، پھر وہ اپنی محنت کا پھل اٹھاتا ہے۔

سقوط خلافت کے بعد امت پر بھی یہی ابتدائے اسلام کے حالات ہو چکے تھے، لیکن سوویت یونین کے افغانستان پر حملے نے امت کو یہ بھولا ہوا سبق بہت بہترین انداز میں پڑھایا۔
اس سبق کا دوسرا اور اہم حصہ امریکہ و ناٹو کے افغانستان پر حملے نے پڑھایا۔ یہ سبق اتنا اہم تھا کہ اس میں صرف کفر ہی نہیں بلکہ امت پر مسلط حکمران طبقے کی حقیقت بھی مجاہدین کو سمجھا دی کہ کفر کے مقابلے کے ساتھ ساتھ ان غدار خائنین اور ظالم حکمرانوں سے بھی امت مسلمہ کو نجات دلانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کفری طاقتوں کا زور توڑنا فرض ہے۔

کیونکہ اگر کفری طاقتوں کا زور ٹوٹ بھی جائے تو مسلط حکمران نفاذ اسلام میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔
اسی طرح یہ حکمران غلبہ اسلام اور نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور کفریہ حکمرانوں کے لیے ڈھال بھی ہیں۔

اللہ ہمیں تمام اسلام دشمنوں کے خلاف شرح صدر کے ساتھ جہاد میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔
اللھم اعننا علی احکامک وانصرنا علی عدونا و ثبت اقدامنا۔

لڑکیوں کی شادی کس عمر میں ہونی چاہیے؟

آمنہ ہاشمی

آج کل پاکستان کے نام نہاد اسلامی آئین کے اندر خلاف اسلام کسی قانون کے نہ بننے کی شق کے ہوتے ہوئے، ایک متنازعہ و غیر اسلامی قانون اسمبلی و سینیٹ میں موجود حیا باختہ خواتین ارکان کی تحریک سے منظور اور پھر صدر کے دستخط سے نافذ بھی کر دیا گیا ہے۔ ان این جی اوز دہ خواتین جن کے اپنے رنگین اسکینڈلز وقتاً فوقتاً میڈیا کی زینت بنتے رہتے ہیں، کو نہ خواتین کے حقوق سے غرض ہے اور نہ ہی بچوں کے حقوق سے۔ انہیں صرف اپنے آقاؤں کے احکام لازمی طور پر نافذ کروانے ہیں، یہی ان کی ڈیوٹی ہے اور اسی کے انہیں اپنے بیرونی آقاؤں اور این جی اوز اور یو ایس ایڈ سے تنخواہیں ملتی ہیں۔

آخر یہ لوگ ایسے قوانین بنانے پر کیوں اتنا زور دیتے ہیں، وہ اس لیے کہ نام کو بھی کوئی اسلامی حکم ہمارے آئین کا حصہ بنے وہ انہیں پیٹ کے درد میں مبتلا کرنے کو کافی ہے، یہ چاہتے ہیں کہ شیطانی قوانین نافذ ہوں تاکہ کبھی کوئی اسلامی حکم پر عمل کرنا چاہے بھی تو اس پر گرفت کی جا سکے۔

اس قانون کے بننے کا پس منظر:

اقوام متحدہ کے ماتحت cedaw/صیداو نامی ایک متنازع عالمی معاہدہ ہے، جس میں مغربی نظریہ کے تحت اور عالمی شیطانی قوتوں کے مفاد میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اس معاہدے پر دنیا بھر کے کئی غیر مسلم ممالک نے دستخط سے انکار کر دیا ہے، بعض ملکوں نے معاہدے پر دستخط کیا ہوا ہے لیکن اقوام متحدہ کے واویلوں کے باوجود اس پر عمل درآمد نہیں کرواتے، لیکن پاکستان ایک اسلامی ملک اور اسلامی معاشرہ کہلانے کے باوجود 1996ء میں ہی اس پر دستخط کر چکا ہے کیونکہ اس قسم کے پروگراموں پر باہر سے پیسے ملتے ہیں۔ اور جہاں پیسہ وہاں پاکستانی مقتدرہ نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام نے ہمیں ہر قسم کے قوانین اور ہر قسم کے حقوق کے بارے میں انتہائی باریکی سے سب کچھ سمجھا دیا ہے اور فقہاء کرام نے لوگوں کو ہر قسم کے مسائل بتانے میں اپنی زندگیاں صرف کی ہوئی ہیں۔ لیکن اسلام پر عمل کرنے سے یا اسلامی نظام کے نفاذ سے ان دنیا داروں کو پیسہ آتا نظر نہیں آتا بلکہ الٹا ڈالر رکتے نظر آتے ہیں۔

اس معاہدے پر عملدرآمد کے لیے اقوام متحدہ کی جانب سے یہاں باقاعدہ مانیٹرنگ کی جاتی ہے اور اپنے چیلوں اور چیلیوں کے ذریعے باقاعدہ کام لیا جاتا ہے۔ اسی معاہدے کا اثر ہے کہ اس قسم کے قوانین بنائے جاتے ہیں۔

لڑکی کی شادی کس عمر میں ہونی چاہیے؟

قدرتی طور پر شادی بلوغت پر ہو جانی چاہیے، یہ طبعی نظام ہے، کیونکہ قدرتی طور پر کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ تقریبا دس سال کی عمر میں بچیاں ایک طرف شدید شرم و حیا میں مبتلا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اپنے نارمل جسمانی و بدنی مسائل اور تبدیلیوں کے بارے میں پریشان ہوتی ہیں لیکن کسی کو بتا نہیں سکتیں۔ اس کے علاوہ یہی زندگی کا سب سے تیز شہوت کا دور ہوتا ہے جس میں ہر لڑکا اپنی طرف کشش کرتا محسوس ہوتا ہے اور لڑکی رنگین خواب و خیالات میں چپکے چپکے مبتلا ہوتی ہے۔ اس دوران اگر اس کی اپنے مناسب عمر کے لڑکے کے ساتھ شادی ہو تو اس کا شوہر اس کی پہلی محبت اور پوری زندگی محبت کا مرکز رہتا ہے، خلافات کے باوجود وہ

اپنے شوہر کی محبت کے سحر سے نہیں نکل سکتی اور یہ سب جانتے ہیں کہ عورت کو جس سے جائز محبت ہو تو عورت اپنی جان تک دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کچی عمر اولاد کی پیدائش اور پرورش کے لیے انتہائی موزوں ہوتی ہے، اس کا بدن ہلکا اور لچک دار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچی عمر میں وہ بالکل سادہ ذہن کے ساتھ کسی بھی ماحول میں بالکل ڈھل جاتی ہے۔ اس لیے اطاعت شعاری اور مزاج بننے میں عموماً کوئی مسئلہ اور سنجیدہ اختلافات پیدا نہیں ہوتے۔ نہ شوہر کے ساتھ نہ گھر والوں کے ساتھ، کیونکہ کم عمر افراد عموماً جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں، لڑکے کے والدین نسبتا جوان ہوتے ہیں، نوجوان جوڑا ان کی سرپرستی میں انتہائی بہترین زندگی گزار سکتا ہے اور خودمختاری تک پہنچتے پہنچتے وہ بڑوں کے تجربات سے پختہ اور سمجھدار ہو چکے ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس بڑی عمر میں لڑکی کا مزاج اور شوہر کے بارے میں اس کی پسند ناپسند کے معیار بنتے اور بدلتے رہتے ہیں، وہ مخصوص ماحول اور آزادیوں کی عادی بن جاتی ہے۔ پھر بہت زیادہ میچیور عمر میں جاکر ہی وہ ان سب عادتوں پر اپنی عقل و سمجھ کے ذریعے قابو پاسکتی ہے ورنہ اسے بہت وقت لگتا ہے اور بعض مزاج کی پکی لڑکیاں الگ گھر لینے کی ضد پر آکر اٹک جاتی ہیں۔

معاشرے میں مشاہدات اور تجربات کی رو سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کی شادی کی بہترین عمر بلوغت سے ہی شروع ہوتی ہے۔ شریعت مطہرہ نے بھی اسی لیے یہ حد مقرر کی ہے، تاکہ زنا جیسے موذی گناہ، دیگر برائیوں اور کئی ان گھریلو مسائل سے بچا جائے، جس کا آج کل ہم سامنا کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ اس مسئلے پر فقط ایک تبصرہ تھا، شریعت کی رو سے اس مسئلے سے آپ واقف ہوں گے یا پھر قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کرسکتے ہیں جو تفاسیر، احادیث اور فقہ کی کتب میں موجود ہے۔

ٹک ٹاکر لڑکیوں کے قتل کے محرکات

حرا لطیف

ہمارا پاکستانی معاشرہ ایک عجیب ملغوبہ سا معاشرہ بن چکا ہے، ایک طرف اسلامی اور ایک طرف مادر پدر آزاد اور ایک طرف نیم مذہبی اور نیم لبرل۔۔۔ ہر طبقے کے لوگ ہمارے معاشرے میں اپنا اپنا زور لگاتے نظر آرہے ہیں۔ نئی نسل کا زیادہ تر وقت تعلیمی اداروں میں گزرتا ہے، جہاں کا ماحول بالکل آزاد ہے، جبکہ گھروں میں نام کو اکثر خود کو مسلمان کہلاتے نظر آتے ہیں۔ اس چیز نے نئی نسل کو ڈبل مائنڈڈ بنا دیا ہے کیونکہ اگر معاشرہ مکمل مغربی طرز کا لبرل ہو تو وہاں لڑکا لڑکی کا آزادانہ میل جول اور ہر قسم کے تعلقات چھپانے کی زحمت نہیں کی جاتی، اور انہیں کسی قسم کی روک ٹوک کا سامنا عموماً نہیں کرنا پڑتا۔ بوائے فرینڈ بنائے جاتے ہیں اور ابارشنز تک میں کوئی عیب نہیں سمجھا جارہا۔

اگر معاشرہ مکمل طور اسلامی ہو تو پھر پردے اور نظریں نیچی رکھنے کے حکم کی وجہ سے مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط نہیں ہوتا، اور بچوں کی جلد شادیاں کروا کر ان کی فطری خواہش کا پاکیزہ انتظام کر دیا جاتا ہے اور اولاد کو نعمت سمجھا جاتا ہے۔ (یاد رہے کہ یہ ہم ایک مثالی اسلامی معاشرے کی نقشہ کشی کر رہے ہیں، جب مکمل اسلامی معاشرہ ہوگا تو اس میں مسائل اور پریشانیاں کم سے کم ہوتی ہیں۔)

دوسری طرف نئی نسل کی تربیت کی بجائے چار پیسے جیب میں آنے پر لوگ ایک دوسرے کے منہ لگتے ہیں، اس وقت پاکستانی معاشرہ عمومی طور پر، بدتمیز عدم برداشت اور تشدد سکھاتا ہے۔ نفس پر قابو رکھنا، عفو و درگذر، نرم مزاجی اور اخلاق، تواضع تو کوئی جانتا ہی نہیں کہ یہ اچھے اور لازمی اوصاف ہیں۔ اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ نوجوان تو کیا بڑے بوڑھے بھی نفس پرستی اور خود غرضی کے سبب ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ آئے روز لوگوں پر تشدد، قتل اور خودکشی کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ سب دینی اخلاق سے نابلد ہونے کی نحوستیں ہیں۔

ایک سبب تو یہ نفس پرستی اور عدم برداشت اور خود غرضی ہے جس کی وجہ سے پچھلے دنوں ایک لڑکے نے اسی طرح کی ایک لڑکی کو قتل کر دیا۔ "نیمے دروں نیمے بروں" کی مثال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچوں کو نمائش کا عادی بنا دیا جاتا ہے، اور گھر والے پیسے آتے دیکھ کر خوشی خوشی سب کچھ کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر لڑکی جب گھر والوں کی بنائی مصنوعی حدود کراس کرنے لگتی ہے تو پھر غیرت کے مارے بھائی مسلمان بن جاتے ہیں اور لڑکی کو مار دیتے ہیں۔ ماضی میں بھی اس قسم کے قتل کے واقعات ہو چکے ہیں۔

دونوں صورتوں میں لڑکی ہی ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ اس کی تربیت میں کمی کی جاتی ہے۔ اس کی جائز ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اور پہلے اسے ہر قسم کی چھوٹ دی جاتی ہے، پھر گھر والے اپنی غلطیاں ماننے کے بجائے لڑکی کو ہی مارنا اپنے نفس کی تسکین کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

لڑکی طبعا نادان ہوتی ہے، تبھی تو اس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے اللہ نے مردوں کو قوام بنایا ہے۔ اگر مرد اپنی ذمہ داری درست طریقہ سے ادا نہیں کریں گے تو قصوروار بھی وہی ہوں گے۔ اللہ تعالی نے پردے کا حکم اسی لیے براہ راست عورتوں کو دینے کی بجائے مردوں کو حکم دیا کہ اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں بیویوں کو کہو کہ اپنے اوپر پردہ ڈالیں۔

خلاصہ یہ کہ، آدھا تیتر آدھا بٹیر جیسے معاشرے میں پھول نہیں کھلتے۔ اسلامی معاشرے کے لیے اسلامی نظام شرط ہے۔ ورنہ ایسے ہی قوم کی بیٹیاں مرتی رہیں گی اور گناہ مردوں کے سر پڑتا رہے گا۔

اسلام میں صنفِ نازک کی رعایت!

جناب عبداللہ

تاریخ شاہد ہے کہ غیر مسلم اقوام نے عورت پر جس قدر ظلم و ستم روا رکھے ہیں، شاید اپنے معاشرے کی کسی اور صنف پر اتنے مظالم انہوں نے نہ ڈھائے ہوں اور اس ''عضو ضعیف'' پر نزلہ گرانے کے لیے مختلف اقوام نے نت نئے طریقے ایجاد کیے ہیں: کہیں اُسے میراث سے محروم کیا گیا، کہیں اُسے اپنے شوہر کی چتا میں جلایا گیا، کہیں اُسے اس جرم بے گناہی میں اپنی زندگی بنانے سے روک دیا گیا کہ اس کا شوہر کیوں مر گیا تھا۔ کہیں اُسے سوسائٹی میں جانور سے بھی بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا کہ مرد تو اُس سے ہر طرح کا نفع اُٹھائے، ہر قسم کی خدمت لے، مگر جب اس کو حقوق دینے کی بات آئے اُسے اذیتیں پہنچائے۔ غرض اس طرح کے بے شمار ظلم و ستم مختلف قوموں اور ملتوں نے ''صنف نازک'' پر ڈھائے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس قدر ہولناک، بھیانک اور انسانیت سوز مظالم مغربی تہذیب نے عورت پر ڈھائے ہیں، شاید اس سے پہلے کسی اور قوم اور ملت نے نہ ڈھائے ہوں۔ ان مظالم کا یہ پہلو اور بھی زیادہ المناک ہے کہ خود عورت کو اس کا احساس نہیں، وہ بے چاری یہ سمجھتی ہے کہ شاید میرے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ یورپ میں اٹھارویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں وہاں کی اکثریت کے دل سے خوفِ خدا کا آخری بیج بھی مارا جا چکا تھا۔ اس سے پہلے یورپ میں وہی فطری تقسیم کار تھی جو اسلام نے متعارف کرائی ہے کہ مرد کما کر لائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ اس زمانے میں جاگیر داری نظام رائج تھا اور تمدن کا نیا ڈھانچہ وجود میں نہ آیا تھا، اس لیے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے، اور اس وقت معیارِ زندگی بھی سادہ تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہ تھی، اس لیے مرد نے اس تقسیم کار کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اٹھارویں صدی میں جب مشین ایجاد ہوئی تو یورپ کے اندر صنعتی انقلاب رونما ہوا جس نے اہلِ یورپ کی زندگی کے ہر شعبے پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ جاگیر داری نظام نے دم توڑ دیا اور سرمایہ داری نظام نے اس کی جگہ لے لی، شہروں میں بڑے بڑے کارخانے کھلنے لگے اور دیہاتی آبادیاں جو جاگیرداروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکی تھیں، شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئیں۔ اس پورے نظامِ معیشت کی تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگوں کا معیارِ زندگی بھی بڑھنے لگا، ہر شخص کو سوسائٹی میں اپنا وقار باقی رکھنے کے لیے کافی سرمایہ کی ضرورت پیش آئی، چنانچہ پیسہ کمانے کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی، وقت کی رفتار کے ساتھ طرزِ بود و باش بدلتا رہا، ضروریاتِ زندگی بڑھتی ہی چلی گئیں، اس لیے حصولِ زر کی دوڑ شدید تر ہوتی گئی۔ ان حالات میں مغربی مرد کی خود غرض طبیعت جو ہمیشہ سے بغیر کوئی قربانی دیئے عورت سے نفع اٹھاتی چلی آئی تھی، برداشت نہ کر سکی۔ اس لیے کہ سرمایہ اس کی اپنی ضروریات کے لیے بمشکل مہیا ہوتا ہے، اس میں عورت کو بھی کہاں سے حصہ دار بنائے؟ اس کے لیے یا تو اپنی ضروریاتِ زندگی میں کمی کرے یا مزید پیسہ حاصل کرنے کے لیے اپنی جان پر اور بوجھ ڈالے۔ نظامِ معیشت اور طرزِ تمدن کے اس غیر معمولی انقلاب کے بعد مرد کو عورت کا گھر میں رہنا دو وجہ سے بری طرح کھٹکنے لگا: ایک تو وہ اس عورت سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا، صنعتی انقلاب کے بعد گھر سے دور دراز مصروفیتیں زیادہ تھیں، اس لیے جاگیر دارانہ نظام کے برعکس اُسے گھر سے دور رہنا پڑتا۔ دوسرا معیارِ زندگی کے بلند ہونے کی وجہ سے اپنے مصارف کا برداشت کرنا ہی مشکل تھا، اس لیے اسے اپنے ساتھ ایک اور فرد کے لیے محنت و مشقت اٹھانا اپنے نفس پر ایک غیر ضروری بوجھ محسوس ہونے لگا، ان دونوں مشکلات کا حل اسے ایک ہی نظر آیا کہ اب کسی طرح عورت کو بھی کمانے پر آمادہ کرو، تاکہ حصولِ زر کی مشکلات بھی ختم ہوں اور عورت کے ہر قدم پر ساتھ رہنے سے اس نفسانی جذبے کی تسکین ہو جو رگ و پے

میں پیوست ہوچکا ہے۔ یہ بات اگر سیدھے سادے انداز سے عورت سے کہی جاتی تو وہ مرد کی اس انسانیت سوز خود غرضی سے خبردار ہوجاتی کہ وہ ایک طرف تو ہر قدم پر عورت کے وجود سے اپنی جنسی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف جب اسی عورت کے لیے روٹی کے چند ٹکڑے مہیا کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو اسے یہ کام دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ عورت یہ سوچتی کہ مرد کو اپنی جسمانی تکالیف کا تو اتنا احساس ہے کہ وہ ان کی وجہ سے عورت کو گھر سے نکالنا چاہتا ہے، مگر اسے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ عورت جیسی صنف نازک روپیہ کمانے اور گھر کا انتظام کرنے کے دونوں کام کس طرح کرے گی؟ اپنی اس خود غرضی پر پردہ ڈالنے کے لیے مغربی مرد کی عیّاری نے جو ہم رنگِ زمین جال تیار کیا، وہ اس قدر نظر فریب تھا کہ بے چاری عورت آج تک اس جال میں پھنسی ہونے کے باوجود اس کی دلفریبی میں مگن ہے، اسی نظر فریب جال کا دلکش اور معصوم نام ''تحریک نسواں'' ہے۔ مرد نے اپنی اسی خود غرضی پر عمل کرنے کے لیے آزاد خیالی کا سہارا لیا اور وہ لبرلسٹ جو عرصۂ دراز سے یورپ کی معاشی، اقتصادی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے تھے، اس کام کے لیے موزوں ترین ثابت ہوئے، چنانچہ اس مقصد کے لیے ''عورتوں کی آزادی'' کا نعرہ لگایا اور عام مطالبہ کیا کہ عورت کو گھر کی چاردیواری میں محصور رکھنا اس پر ظلم ہے، مرتبہ ومقام کے لحاظ سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں، اُسے مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لینا چاہیے، حصولِ معاش کے معاملہ میں اسے مرد کا محتاج ہونے کی بجائے مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ نعرہ ہر اس مرد کی دلی آواز تھا جو نئے طرزِ زندگی کے بعد عورت کا گھر میں رہنا اپنی حرص وہوس کی وجہ سے برا سمجھ رہا تھا، چنانچہ لبرل پارٹی کی یہ آواز یورپ کے ہر خطہ سے اٹھنی شروع ہوگئی، بے چاری عورت مرد کی اس مکارانہ چال کو نہ سمجھ سکی اور اس نے بخوشی گھر کو خیر آباد کہہ کر مرد کی حرص وہوس کو نہایت اطمینان سے پورا کردیا، پھر مرد نے اپنی چال سے اس صنف سے بڑے بڑے کام لیے۔ عورت جب بازاروں میں نکلی اور دفتروں میں داخل ہوئی تو مرد نے اپنی ہوسناک نگاہوں کی تسکین کے علاوہ اس کے ذریعہ اپنی تجارت بھی خوب چمکائی۔ دُکانوں اور ہوٹلوں کے کاؤنٹروں پر، دفتروں کی میزوں پر، اخبارات واشتہارات کے صفحات پر اس کے ایک ایک عضو کو سر بازار رُسوا کیا گیا اور گاہکوں کو اس کے ذریعہ دعوت دی گئی کہ آؤ! اور ہم سے مال خریدو، یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر فطرت نے عزت وآبرو کا تاج رکھا تھا اور جس کے گلے میں عفت وعصمت کے ہار ڈالے تھے، دُکان کی زینت بڑھانے کے لیے ایک شوکیس اور مرد کی تھکاوٹ دور کرنے کیے لیے ایک تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔ اسی دوران عورت کو اسی حال پر خوش رکھنے اور اُسے تسلّی دینے کے لیے نت نئے افسانے گھڑے گئے جس سے عورت کو یہ محسوس ہوا کہ واقعی ہمارے مرد ہمارے بڑے ہمدرد ہیں اور ہمیں ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں، چنانچہ اسے مساویانہ حقوق کے نام پر فطرت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا، نتیجہ معلوم جو فطرت سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہوجائے گا۔ آج اسی قسم کی عورت اپنا تشخص ڈھونڈ رہی ہے اور جہالت وضلالت کی تاریکیوں میں کبھی ایک دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے تو کبھی دوسری دیوار سے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ مردوں نے عورتوں کو فطری حقوق نہیں دیئے یا نہیں بتائے اور اسے اس کا صحیح معاشرتی مقام نہیں بتایا۔ ہم آئندہ سطور میں عورت کی ان استثنائی صورتوں کا اجمالاً تذکرہ کریں گے جو اس کے متعلق اسلامی قوانین میں موجود ہیں اور وہ عورت کے فطری تشخص کے برقرار رکھنے کی واحد ضمانت ہیں: ۱:... منصب حکمرانی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ"۔ (النساء:۳۴)-------''مرد قوام نگران ہیں عورتوں پر''۔ وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا، مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے۔ آزادئ نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آج بھی ''مہذّب'' دنیا میں مرد ہی جنس برتر (Dominant Sex) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادئ نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مختلف شعبوں میں اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (Biological Factores) کارفرما ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم گن کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے کہ: ''مرد

اور عورت میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہوسکتے، بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔ ''
کسریٰ کے مرنے کے بعد اس کے درباریوں نے اس کی لڑکی کو حکمران بنایا، آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لن يفلح قوم وَلَّوْا أمرَهم امرأة''۔ یعنی ''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنی حکمرانی عورت کو دے دی''۔ جدید تحقیق بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہے، چنانچہ ایک امریکی سرجن Edan Berman کا فیصلہ ہے کہ: ''عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لیے جذباتی ثابت ہوسکتی ہیں''۔ عورت صنف نازک ہے، جبکہ مرد قوی۔ عورت میں انفعالیت ہے اور مرد میں فعالیت اور جارحیت، لہٰذا فطری طور پر عورتیں نازک مزاج اور جذباتی ہوتی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ۱۹۸۴ء میں خواتین کی حالت (Status Of Women) پر ایک مفصل مقالہ ہے، اس مقالے کا ایک ذیلی عنوان یہ ہے: ''مرد اور عورت کے فرق کا سائنسی مطالعہ ''مقالہ نگار کے مطابق'' جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے لحاظ سے فرق ہے''۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''اوصافِ شخصیت کے اعتبار سے مردوں کے اندر جارحیت اور غلبہ کی خصوصیات زیادہ پائی جاتی ہیں، ان میں حاصل کرنے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں عورتیں سہارا چاہتی ہیں، ان کے اندر معاشرت پسندی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمت ہوجاتی ہیں۔ عورت کے اندر انفعالیت اور مرد میں

فعالیت زیادہ ہوتی ہے۔'' نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (۱۸۷۳ء-۱۹۴۴ء) نے مذکورہ موضوع پر نہایت نفیس بحث کی ہے، وہ اس معاملہ کی حیاتیاتی تفصیلات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''مرد اور عورت کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں وہ محض جنسی اعضاء کی خاص شکل، رحم طور کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم کی وجہ سے نہیں ہیں، وہ اس سے زیادہ بنیادی نوعیت کے ہیں، وہ خود نسیجوں کے بناوٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پورے نظام جسمانی میں خصوصاً کیمیائی مادے کے سرایت کرنے سے ہوتے ہیں، جو کہ خصیۃ الرحم سے نکلتے ہیں۔ ان بنیادی حقیقتوں سے بے خبری نے ترقیٔ نسواں کے حامیوں کو اس عقیدہ تک پہنچایا ہے کہ دونوں صنفوں کے لیے ایک طرح کی تعلیم ایک طرح کے اختیارات اور ایک طرح کی ذمہ داریاں ہونی چاہئیں، باعتبار حقیقت عورت نہایت گہرے طور پر مرد سے مختلف ہے۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے، یہی بات اس کے اعضاء کے بارے میں بھی درست ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کے بارے میں عضویاتی قوانین بھی اتنا ہی اٹل ہیں جتنا کہ فلکیاتی قوانین اٹل ہیں، ان کو انسانی خواہشوں سے بدلا نہیں جاسکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ان کو اسی طرح مانیں، جیسے کہ وہ ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں، وہ مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا کہ مردوں کا ہے، انہیں اپنے مخصوص عمل کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہیے''۔ امریکی پروفیسر گولڈ برگ کہتے ہیں: ''اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد عورتوں سے بہتر (Better) ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مرد عورتوں سے مختلف (Diffrent) ہوتے ہیں، مرد کا دماغ اس سے مختلف طرز پر کام کرتا ہے، جس طرح عورت کا دماغ کام کرتا ہے۔ کچھ عورتیں مستثنیٰ ہوسکتی ہیں، مگر وہ بہت معمولی اقلیت میں ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، رحم مادر سے لے کر سوچنے کی صلاحیت تک یہ فرق دونوں کی حیاتیاتی نوعیت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ کسی قسم کے سماجی حالات سے''۔ امریکہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کافی طاقتور ہے، مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں، بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فی میل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے، چنانچہ تحریک آزادیٔ نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے، ہمیں چاہیے کہ پیدائشی سائنس ایوجنکس (Of ciience Eufenics) کے ذریعہ جنیٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں۔ یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ ''پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ'' (Make Policy Not Coffee) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔ یہ واقعہ اس بات

کا ایک تجرباتی قرینہ ہے کہ وضعی قوانین کے مقابلہ میں الٰہی قانون میں فطرت کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ۲:...فطری تقسیم کار حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبّہین من الرجال بالنساء والمتشبّہات من النساء بالرجال"۔ (مشکوۃ، ص: ۳۸۰) ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے''۔ انسانیت کو مرد و عورت کی صنفی تقسیم کے ساتھ پیدا کرنا براہِ راست خالق کی منصوبہ بندی ہے، اس تقسیم کو باقی رکھنے ہی میں انسانی زندگی کی ترقی ہے، جو مرد یا عورت اس تقسیم کو توڑنے کی کوشش کرے، وہ گویا نظامِ فطرت کو توڑتا ہے، نظامِ فطرت کو توڑنا صرف تخریب ہے، وہ کسی درجہ میں بھی تعمیری کام نہیں ہے، اسلام کے نزدیک مرد و عورت ایک دوسرے کے ہم سر (Duplicates) نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ (Complemen) ہیں اور دونوں میں ناقابل عبور قسم کے حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق تقسیم کار کی حکمت پر مبنی ہے، وہ اس طرح کہ مرد کی کمی کی تلافی عورت اور عورت کی کمی کی تلافی مرد کرے۔

قرضوں کے معاملہ میں اسلام کے قانونِ شہادت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے، قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ''اپنے مردوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، ایسے گواہوں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلادے۔'' چنانچہ حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے، کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵ئ) میں یو۔پی۔ آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے، یہ رپورٹ اخبار کے صفحہ نمبر: ۹ پر ہے۔ اخبار لکھتا ہے: ترجمہ: ''عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں، مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسدان نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں، اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے، صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے''۔ مذکورہ بالا آیت کا تعلق قرض سے ہے، یعنی وہ صورت جبکہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ اس کی ادائیگی ہو، ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا ہے کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کیے جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے، وہ یادداشت ہے اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین حقیقت کے مطابق ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، گویا مرد اور عورت میں گواہی کا فرق بربنائے ضرورت ہے، نہ کہ بربنائے فضیلت۔ قرآنی آیت: "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ" میں فضیلت سے عمومی فضیلت مراد نہیں ہے، بلکہ یہ وہ نوعی فضیلت ہے جو ناگزیر حیاتیاتی فرق کی وجہ سے ہے، ورنہ مطلقاً بحیثیت انسان ہونے کے مرد کو عورت پر کوئی فضیلت نہیں ہے، بلکہ یہ فضیلت فطری صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوئی ہیں اسی جہت سے ہے۔ جیسے پھلوں کے متعلق ارشاد ہے: "وَنُفَضِّلُ بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ"۔ (الرعد:۴) یہاں پر مفسرین نے تفضیل سے مراد فرق اور تنوع لیا ہے، نہ یہ کہ پھلوں میں سے کسی ایک پھل کو دوسرے پھل پر مطلق برتری حاصل ہے، یعنی ہر پھل میں ایک منفرد خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں۔ ہر پھل میں رنگ اور مزہ کے اعتبار سے ایک مزید پہلو ہے جو دوسرے پھل سے مختلف ہے۔ عورت اور مرد میں بھی اسی طرح فرق رکھا گیا ہے۔ ایک صنف کے اندر ایک اضافی خصوصیت ہے تو دوسری صنف میں دوسری اضافی خصوصیت، اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ: "وَلَاتَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ"۔ (النساء: ۳۲) یعنی ''جن چیزوں میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، ان میں ہوس نہ کرو۔ مردوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے۔'' یورپ فیملی سسٹم کی تباہی سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف نے ایک کتاب لکھی ہے ''پروسٹرائیکا'' یہ کتاب پوری دنیا میں مشہور ہے اور شائع

شدہ شکل میں موجود ہے، اس کتاب میں گورباچوف نے عورتوں کے بارے میں ''Status Of Women'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے، اس میں اس نے صاف اور واضح لفظوں میں یہ بات لکھی ہے کہ: ''ہماری یورپ کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا، اس کو گھر سے نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا، اس لیے کہ مرد بھی کام کررہے ہیں اور عورتیں بھی کام کررہی ہیں، لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوگیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں، وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پیداوار پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے، لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پروسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کررہا ہوں، اس میں میرا ایک بڑا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے، اس کو گھر میں واپس کیسے لایا جائے؟ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے، ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہوچکا ہے، اسی طرح ہماری پوری قوم تباہ ہوجائے گی''۔

نفع بخش کاروبار ایک مرتبہ اس لیے سروے کیا گیا کہ معلوم کیا جائے کہ آج کل نفع بخش کاروبار کونسا ہے؟ چنانچہ رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ''ماڈل گرل'' کا کاروبار ہے، اس لیے کہ ایک ''ماڈل گرل'' مصنوعات کے اشتہارات پر اپنی عریاں تصویر دینے کے لیے صرف ایک دن کے ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہے اور اس ایک دن میں وہ تاجر اور سرمایہ کار اپنی مرضی سے جتنی تصویریں جس انداز سے اور جس زاویے سے اتارنا چاہے، اُتارتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنی مصنوعات کو بازار میں پھیلاتا ہے، آج یہ عورت ایک بکاؤ مال بن چکا ہے اور سرمایہ دار اُس کو جس طرح چاہتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عورت نے گھر سے باہر نکل کر اپنی قدر و منزلت اور اپنا مرتبہ کھودیا اور اس کا یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ چند اصولی باتیں

۱:...وضعی قانون کوئی قابل قبول اصول وقانون دریافت کرنے میں ناکام رہا ہے اور وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گا، کیونکہ انسان کی محدودیت یہاں راہ میں حائل ہورہی ہے۔

۲:... وہ واقعہ جس نے انسان کے لیے اصول وقانون کی دریافت کو ناممکن بنادیا ہے، اسی میں الٰہی قانون کی صداقت کا قرینہ چھپا ہوا ہے، کیونکہ ایک طرف انسانی ذہن کی محدودیت اور دوسری طرف حقائق کی وسعت ظاہر کررہی ہے کہ کوئی ایسا ذہن ہو جو انسانی ذہن سے برتر ہو اور جس کے اندر سارے حقائق موجود ہوں۔ کائنات میں ایسے واقعات ہیں جو فطرت اور جبلّت کی سطح پر الہام کا امکان ثابت کررہے ہیں۔ الٰہی قانون اس میں صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس الہام کو انسان تک وسیع کردیتا ہے۔ یہ واقعہ اس مفروضہ کی مزید تائید کرتا ہے کہ موجودہ الٰہی قانون میں کچھ ایسی برتر امتیازی خصوصیات ہیں جو اسی وقت قابل فہم ہوسکتی ہیں، جب کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایسے ذہن سے نکلا ہے جو انسان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع طور پر حقائق کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تحریک طالبان پاکستان کے شعبہ معارف (تعلیم) کے مسئول
مولانا قاری مجیب الرحمن بارکزئی حفظہ اللہ کے ساتھ خصوصی انٹرویو

ٹیم مجلہ طالبان: مولانا صاحب! سب سے پہلے قارئین مجلہ طالبان کو اپنا تعارف کروائیں۔

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی: الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد: فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

يؤتي الحكمة من يشآء ومن يؤتى الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا وما يذكر أولو الألباب. وقال النبي صلى الله عليه وآله وسلم من دخل المسجدا لخير ليعلمه أو يتعلمه فهو كالمجاهد في سبيل الله.

سب سے پہلے میں ٹیم مجلہ طالبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں اور ہمارے ادارے کو وقت دیا اور ہمیں موقع فراہم کیا کہ تحریک طالبان پاکستان کے شعبہ تعلیم و تعلم کے حوالے سے عوام پاکستان سے مخاطب ہوں۔

میرا نام مجیب الرحمن بارکزئی ہے، اور میرا تعلق بنوں سے جنوبی وزیرستان کی طرف مزنگہ کے علاقے سے ہے۔ میں نے حفظ قرآن کریم و تجوید مدرسہ المرکز الاسلامی بنوں سے 1996ء میں کیا۔ (جس کا مہتمم مولانا سید نسیم علی شاہ صاحب ہے) پھر علمی سلسلہ شروع ہوا اور لکی مروت، بنوں، شمالی وزیرستان، ہنگو، سوات، کوئٹہ، رحیم یار خان کے اسفار کیے اور پھر 2008ء میں جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے دورہ حدیث کیا۔

ٹیم مجلہ طالبان: یہ بتلائیں کہ تحریک طالبان پاکستان کے شعبہ معارف کے تحت کتنے مدارس کام کر رہے ہیں؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی: تحریک طالبان پاکستان کے شعبہ معارف کے تحت تقریبا 90 مدارس کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک جامعہ (ابتدائیہ تا تخصص فی الفقہ والقضاء)، چار دارالعلوم (اعدادیہ تا دورہ حدیث ، مدارس (فنون) اور حلقہ جات (قاعدہ، حفظ و ناظرہ) شامل ہیں۔

ٹیم مجلہ طالبان: مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب کونسا ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی: نصاب ہمارے تحریک طالبان پاکستان کے اپنے جید علماء و شیوخ کرام کی کمیٹی نے تیار رکھا ہے، جس میں طلباء کی استعداد اور افادے کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے اور یہ اعدادیہ تا دورہ حدیث ہے۔ یاد رہے کہ اس نصاب کا اکثر حصہ پاکستان کے مدارس حالیہ نصاب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ ادارہ

ٹیم مجلہ طالبان: کیا آپ کے شعبہ کے تحت اسکول سسٹم بھی ہے، اگر ہے تو اس کا نصاب کیا ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی: اسکولز موجود ہیں جو کہ پرائیویٹ ہیں مگر تحریک طالبان پاکستان کے ادارہ معارف کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری کوشش اور محنت یہ ہے کہ وہ اسکول و مدرسے کا مشترکہ نظام ہو۔ الگ اسکول اور الگ مدرسہ نہ ہو جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فضلاء ایک ہی نظریہ یعنی خالص دینی اسلامی نظریہ کے حاملین ہوں اور وہ دینی و عصری تعلیم، کمپیوٹر وغیرہ و دیگر مقتضائے حال امور سے واقف ہوں۔ مثلا اعدادیات میں اردو، انگلش، ریاضی، عربی، اسلامیات اور کمپیوٹر پڑھاتے ہیں۔ اسی طرح آگے جاتے طلباء کیلئے کتب میں اضافہ کیا جاتا ہے۔

ٹیم مجلہ طالبان: مدارس اور اسکول میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کتنی ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : یہ تعداد ہزاروں میں ہے،جس کا اپڈیٹڈ شمارہ ابھی موجود نہیں ہے۔

ٹیم مجلہ طالبان : اساتذہ و دیگر عملے کی تعداد کتنی ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : اساتذہ کی تعداد تقریبا 1000 ہے۔ جن میں اسکول، قاعدہ تا افتاء و قضاء کے اساتذہ شامل ہیں۔

ٹیم مجلہ طالبان : تعلیمی سلسلہ کے علاوہ آپ کونسی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : اس کے علاوہ میں مدراس کے فنون کی کتابیں پڑھاتا ہوں، بطور قاری کچھ طلباء کو تجوید اور مشق بھی کراتا ہوں اور ایک جامعہ کا مسئول بھی ہوں۔

ٹیم مجلہ طالبان : پاکستان میں مدارس و اسکولز کے طلبہ کو آپ کا کیا پیغام ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : مدارس و اسکولز کے طلباء کو میرا یہ پیغام ہے کہ چونکہ ہم مسلمانوں کی اولاد اور مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں، اس لیے دوران تعلیم یہ ارادہ کیے رکھیں کہ میں اپنی تعلیم سے دین کی سربلندی کیلئے خدمات انجام دیں گے۔ ہمارے مشترکہ نظام تعلیم کا انتظار کریں، جس میں ہمارے دنیا و آخرت کی بھلائی ہوگی۔ ان شاءاللہ۔ تمام طلباء یاد رکھیں کہ تحریک طالبان پاکستان آپ کے بچوں کا بہتر مستقبل چاہتی ہے، قیادت فکرمند ہے کہ پاکستان کا بچہ بچہ اسلام کا علمبردار بنے، کسی کی فکر مغرب زدہ نہ ہو، مغرب سے متاثر نہ ہو اور صحیح سالم عقیدے کا حامل ہو۔

ٹیم مجلہ طالبان : کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تحریک طالبان پاکستان اسکول سسٹم کے خلاف ہے، اس حوالے سے کیا کہیں گے؟۔

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : یہ بات غلط ہے، بلکہ ہم انہیں اثاثہ اور تحریک طالبان پاکستان کا مستقبل سمجھتے ہیں اور اللہ سے دعاگو ہیں کہ وہ تحریک طالبان پاکستان کی چھتری تلے اسلامی نظام کے نفاذ کا حصہ بنیں۔

ٹیم مجلہ طالبان : عوام پاکستان و مجاہدین کو آپ کا کیا پیغام ہے؟۔

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : پاکستان کے عوام کو میرا یہ پیغام ہے کہ پاکستان کو معرض وجود میں آئے 80 سال ہونے کو ہیں، یہ جس مقصد کیلئے حاصل کیا گیا کہ یہاں لا الہ اللہ ہوگا اور یہاں اسلام کا بول بالا ہوگا۔ یہ تو نہ ہوا بلکہ اسلام مخالف اعمال ہوئے اور فقط "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ لگا لیا گیا۔ تو عوام اس دھوکے اور فریب پر نظر رکھتے ہوئے ریاست پر مسلط چند لوگوں کی حمایت سے پیچھے ہٹ جائیں۔
مجاہدین، عوام کے ساتھ شفقت کا رویہ رکھیں، ترحم سے کام لیں کیونکہ پاکستان کے عوام اسلام پسند اور قربانی والے ہیں۔

ٹیم مجلہ طالبان : پاکستان کے دینی و دنیوی علوم کے طلبہ کو آپ کا کیا پیغام ہے؟

مولانا مجیب الرحمن بارکزئی : دینی علوم کے طلباء کرام کو میرا پیغام یہ کہ وہ پختہ علوم حاصل کریں۔ اپنے حق پرست، جہاد سے جڑے اور پختہ علوم والے اساتذہ پر اعتماد کریں جن کا معاشرے میں ایک کردار اور اثر رہا ہے۔ اسی طرح دنیوی علوم کے طلباء بھی خیال رکھیں کہ وہ قوم کا مستقبل ہیں اور اپنے علوم اور کردار کا خیال رکھیں، آپ ہی ہمارا مستقبل اور کارآمد اثاثہ ہیں۔

ایک تھی زلیخہ

ام مریم

بابا: آپ اپنے ساتھ رسالہ لے کر آئے ہیں۔
زلیخہ سوالیہ نگاہوں سے اپنے والد کے خالی ہاتھوں میں جہادی رسالہ تلاش کر رہی تھی۔
بیٹی، وہ گاڑی میں بھول آیا ہوں، ابھی لے کر آتا ہوں۔ واپس مڑتے ہوئے زلیخہ کے بابا نے گاڑی کھول کر جہادی رسالہ اٹھایا اور گھر کی جانب قدم بڑھائے۔
زلیخہ نے رسالے کو اٹھا کر حسب عادت اس کی خوشبو سونگھی۔ رسالے کی عجیب سی مہک کو اپنے سانسوں میں اتارا اور باہر صحن میں لگے درخت کے نیچے بیٹھ کر رسالے کو کھولا۔ پہلے ہی صفحے پر ایک جانب حضرت خدیجہ اور صحابیات رضوان اللہ علیھن کا نام اور دوسری جانب سونے کی طرح چمکتا ہوا زرد گنبد، جس کے نیچے لکھا تھا: بیت المقدس کسی ایوبی کا منتظر ہے۔" ہمیشہ کی طرح زلیخہ کی تمام تر توجہ سمیٹ گیا۔

ایک عجیب سی اداسی نے ہمیشہ کی طرح اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا ابھی تک کوئی ایوبی ثانی نہیں آیا کہ بیت المقدس کو آزاد کروا سکے۔ زلیخہ ایک دینی مزاج گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، جہاں صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ساتھ ہر دینی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لاشعور کے اس دور میں زلیخہ نے اپنے اطراف جہاد کا خوب تذکرہ سنا تھا اور جہاد و مجاہدین سے محبت اس کے شعور میں رچ بس گئی تھی۔
وقت گزرتا گیا تو ماحول اور منظر سب بدل گئے۔ جہاں جہاد کے تذکرے ہوتے تھے، وہاں زبانوں کے لیے تالے خرید لیے گئے۔ مجاہد کو دہشت گرد بنا دیا گیا۔ جو شخص جہاد کرتا یا جہاد کر چکا ہوتا، وہ حکومت وقت کی پکڑ میں آ جاتا۔ خفیہ ایجنسیاں ملک بھر میں پھیل چکی تھیں، جو راتوں کو اچانک آ کر کسی کو بھی اٹھا کر لے جاتیں۔ چادر و چار دیواری کا تقدس ہر روز پامال ہوتا تھا۔ لوگ جہاد کے تذکرے سے ڈرنے لگے تھے۔ عقوبت خانے و جیلیں آباد ہو چکی تھیں۔ ایسا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ لوگ اپنے ہی جگر گوشوں سے، جنھوں نے جہاد کیا ہوتا تھا، تعلق رکھتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ مجالس جہاد کے ذکر سے خالی ہو گئی تھیں۔ مدارس میں جہاد کے ابواب کو بس سرسری سا پڑھایا جانے لگا۔ مدارس اور مساجد میں جہاد پر بات کرنا جرم سمجھا جانے لگا۔

اس صورتحال میں چند گنے لوگ ہی تھے جو ثابت قدم رہے، جنھوں نے جہاد کی محبت سے قدم، قلم، زبان پیچھے نہیں ہٹائیں۔ دنیا نے مجاہد کو دہشت گرد کہا تو ان چند لوگوں نے انہیں اللہ کی راہ میں چلنے والا مجاہد کہا۔ دنیا نے جو القاب دیے، سو دیے، لیکن ان چند لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

جب زلیخہ نے لاشعور کی دنیا سے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو مدرسے میں پڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہاں بھی ارد گرد کی طرح کچھ لوگ ہی ہیں جو نظریات پر کاربند ہیں، جو آج بھی مجاہد کی شان پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ ان کے جذبات اور قربانی سامنے والوں کے دلوں میں ایسے اترتی ہیں کہ سامنے والے کا ایمان تازہ ہو جاتا۔ لیکن وہاں بھی ان معلمات کو پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

زلیخہ کے دل میں ایک چیز، جو لاشعور سے ساتھ چلتی آ رہی تھی، وہ بیٹھ گئی تھی۔ جہاد کی محبت اس کی رگوں میں رچ بس گئی تھی کہ اگر اس کی اولاد ہوئی تو وہ اسے غرباء کے راستوں کا مسافر بنائے گی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی

آکر کسی کو بھی اٹھا کر لے جاتیں۔ چادر و چار دیواری کا تقدس ہر روز پامال ہوتا تھا۔ لوگ جہاد کے تذکرے سے ڈرنے لگے تھے۔ عقوبت خانے و جیلیں آباد ہو چکی تھیں۔ ایسا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ لوگ اپنے ہی جگر گوشوں سے، جنھوں نے جہاد کیا ہوتا تھا، تعلق رکھتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ مجالس جہاد کے ذکر سے خالی ہو گئی تھیں۔ مدارس میں جہاد کے ابواب کو بس سرسری سا پڑھایا جانے لگا۔ مدارس اور مساجد میں جہاد پر بات کرنا جرم سمجھا جانے لگا۔

اس صورتحال میں چند گنے لوگ ہی تھے جو ثابت قدم رہے، جنھوں نے جہاد کی محبت سے قدم، قلم، زبان پیچھے نہیں ہٹائیں۔ دنیا نے مجاہد کو دہشت گرد کہا تو ان چند لوگوں نے انہیں اللہ کی راہ میں چلنے والا مجاہد کہا۔ دنیا نے جو القاب دیے، سو دیے، لیکن ان چند لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

جب زلیخہ نے لاشعور کی دنیا سے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو مدرسے میں پڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہاں بھی ارد گرد کی طرح کچھ لوگ ہی ہیں جو نظریات پر کاربند ہیں، جو آج بھی مجاہد کی شان پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ ان کے جذبات اور قربانی سامنے والوں کے دلوں میں ایسے اترتی ہیں کہ سامنے والے کا ایمان تازہ ہو جاتا۔ لیکن وہاں بھی ان معلمات کو پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

زلیخہ کے دل میں ایک چیز، جو لاشعور سے ساتھ چلتی آرہی تھی، وہ بیٹھ گئی تھی۔ جہاد کی محبت اس کی رگوں میں رچ بس گئی تھی کہ اگر اس کی اولاد ہوئی تو وہ اسے غرباء کے راستوں کا مسافر بنائے گی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ قسمت دور کھڑے اس پر مسکرا رہی تھی۔ جب اس نے درس نظامی میں داخلہ لیا تو گھر والوں نے اس کی رخصتی کر دی۔ کم عمری کی شادی کی وجہ سے سسرال کی طرف سے اسے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔

وہ جو خواب اس کے ادھورے رہ گئے تھے آگے پڑھنے کے، اس کی تکمیل کے اندر کچھ چیزوں سے محرومی بھی شامل رہی۔ وقت آگے بڑھتا رہا۔ درس نظامی، تخصص، تجوید کی تکمیل کے بعد تدریس کا سلسلہ چل پڑا۔ اولاد کی خواہش اور اولاد کو مجاہد بنا کر اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا ناتمام عہد آج بھی اسے بے سکون کر دیتا۔

اللہ کی غالب تقدیر نے اس خواہش کو تو مکمل نہ ہونے دیا، لیکن اسی چیز نے اسے لکھنے لکھانے سے وابستہ کیا۔ وہ اپنے نظریات کو لکھنے لگی تھی، اپنی سوچوں کو قلم سے قوت گویائی دینے لگی تھی۔ اپنی معلمہ، جن کے تین بھائی فتح افغانستان میں یکے دیگرے شہید ہوئے تھے، ان سے اکثر ان موضوعات پر گفتگو ہوتی تو وہ یہی خواتین کے فرائض، جہاد میں خواتین کے کردار، اولاد کی تربیت، موقع لگنے پر مجاہدین کی خدمت، ان کے کپڑے دھونا، ان کے لیے کھانا بنانا، یہی سمجھاتی کہ خواتین کا جہاد اوران کا اجر ان کاموں میں ہے۔

ہوسکتا ہے زلیخہ کی اولاد ہوتی، لیکن وہ ان کی تربیت اس نہج پر نہ کر پاتی۔ اللہ تعالیٰ تو نیتوں پر اجر دیتے ہیں، اور آپ کو آپ کا اجر مل رہا ہے۔ آپ تدریس سے منسلک ہیں۔
آپ طالبات کا ذہن بنائیں،

آپ قلم سے منسلک رہیں۔
آپ لکھ کر لوگوں کے نظریات پختہ کریں۔
آپ اس لحاظ سے محنت کریں۔
اور یہ چیز اس کے دل میں بیٹھ گئی کہ جہاد بالسیف سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔
لیکن اگر جہاد بالسیف پر آپ قادر نہیں، تو آپ جہاد کے دیگر شعبوں کو نظر انداز مت کریں۔
آپ زبان سے، قلم سے، اپنے افعال سے، اپنے اعمال سے جہاد کا تذکرہ کیا کریں۔
جس چیز پر آپ کو قدرت حاصل ہو، اس کے ذریعے سے آپ جہاد کا تذکرہ کریں۔
پھر اگرچہ بستر مرگ پر ہی موت کیوں نہ آجائے، راہ غرباء کے ساتھیوں کا

ساتھ ضرور ملے گا، ان شاء اللہ۔

اس کہانی کا مطلب کسی کے حالات ذکر کرنا نہیں، بلکہ اپنی تمام بہنوں کو اس بات پر متوجہ کرنا مقصود ہے جنھیں اللہ رب العزت نے نرینہ اولاد سے نوازا ہے۔
کہ آپ سب اپنی گود کو شیروں کا کچھار بنائیں، اپنی اولادوں کو راحت و تعیش کا عادی مت بنائیں، بلکہ ان کی تربیت بہادر مرد اور مجاہد کے طور پر کریں۔
اس نعمت کی قدر کریں۔ ہم پر کفار چومکھی لڑائی مسلط کر چکے ہیں۔ ہم نے صرف اپنی اولادوں کو گھروں میں بند کر کے ان کا تحفظ نہیں کرنا، بلکہ ان کو امت کا تحفظ کرنے والا مرد مجاہد، ملا عمر، شیخ اسامہ، محمد ضیف، یحیی سنوار، و حکیم اللہ محسود بنانا ہے۔

ہمارے سامنے کتنے ہی نوجوان جوانی کی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کو ان کے والدین موت سے نہیں بچا سکتے، بلکہ موت سے تو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔
میری بہنوں!
پھر ہم کیوں اپنی اولادوں کو ایسی موت کے لیے تیار نہ کریں جس پر ہم سب فخر کریں، پوری امت فخر کرے؟
اور یہی اس نعمت کی قدر کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔

ایک مختصر یاددہانی

ڈاکٹر خولہ الاسدی

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا :

دنیا میں اس طرح ہو جا جیسے تو اجنبی یا راستہ چلنے والا (مسافر) ہو۔"

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے :

شام ہو جائے تو صبح کے منتظر نہ رہو اور صبح کے وقت شام کے منتظر نہ رہو، اپنی صحت کو مرض سے پہلے غنیمت جانو اور زندگی کو موت سے پہلے۔"

صحیح بخاری (6416)

سبق :

ایک مسلمان عورت کی زندگی کا مقصد دنیاوی فیشن پرستی یا رسم و رواج پر عمل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی توجہ ان کاموں اور چیزوں پر مرکوز رکھتی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی منزل مقصود، یعنی جنت الفردوس تک پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں سے ان ابدی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے، اور وہ ان نعمتوں سے محظوظ ہونے کی خواہاں ہے۔

اس لیے وہ اس دنیا سے صرف اتنا ہی لیتی ہے جو اس سفر میں اسے اس عظیم منزل تک پہنچا دے، اور ان سب چیزوں سے گریز کرتی ہے جو اس راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

اسے معلوم ہے کہ ایک دن اس عارضی زندگی کا خاتمہ ہونا ہے، اس لیے وہ ہر لمحہ تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی طرزِ زندگی، اخلاق، یہاں تک کہ پہننے اوڑھنے سے بھی تقویٰ اور فرمانبرداری کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ان لوگوں سے اجنبی دکھتی ہے جن کا مقصد صرف دنیاوی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔

پس، وہ ان دنیا پرست لوگوں کے لیے ایک اجنبی ہوتی ہے، لیکن جس کا خواب دیکھتی ہے وہ اس سب سے اعلیٰ وارفع ہے، اور اسی کو پانے کے لیے وہ کوشاں ہوتی ہے۔

پس اے میری مسلمہ بہن!

دنیا کی رنگینیوں سے متاثر ہوئے بغیر حق و سچ کے راستے پر ثابت قدم رہنا، دنیا کے فتنوں اور فیشن پرستی سے خود کو بچا رکھنا، اور ان خوابوں کی تکمیل کے لیے قلیل الوقت مصائب اور مشکلات برداشت کر لینا۔
آپ ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جن کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا :

"فطوبى للغرباء"

~خوشخبری ہو اجنبیوں کے لیے۔

خواتین کی دینی علوم سے دوری

عائشہ محمد

اسلام ایک ایسا مکمل دین ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی، روحانی و دنیاوی اور ظاہری و باطنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس دینِ حق نے مرد و عورت دونوں کو علم کی روشنی سے منور ہونے کا حق دیا ہے بلکہ فرض قرار دیا ہے۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے دور میں خاص طور پر مسلم خواتین میں دینی تعلیم کی طرف رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ دنیاوی تعلیم کو ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا جبکہ دینی تعلیم کو فراموش کر دیا گیا لیکن بعض معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی رکاوٹوں کی وجہ سے خواتین دینی علوم سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ مسئلہ نہ صرف ان کی اپنی روحانی اور دینی تربیت کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ پورے معاشرے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی روشنی میں علم کی اہمیت :

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں علم اور تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"(الزمر: ۹)

"کہہ دیجیے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟"

یہ آیت علم اور جہل کے درمیان واضح فرق بیان کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے :

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم"(ابن ماجہ)

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

اس حدیث میں "مسلم" کا لفظ عام ہے جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔

خواتین کی دینی تعلیم کی تاریخی حیثیت :

اسلامی تاریخ میں خواتین نے علم دین حاصل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علم حدیث، فقہ اور تفسیر کی ماہر عالمہ تھیں اور ان سے بے شمار صحابہ نے علم حاصل کیا۔

اسی طرح ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی حدیث کی راویہ تھیں۔

یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام خواتین کو دینی علوم سیکھنے کی مکمل اجازت دیتا ہے۔

خواتین کی دینی علوم سے دوری کے اسباب :

۱۔ معاشرتی رکاوٹیں :

بعض معاشروں میں خواتین کو گھر تک محدود کر دیا جاتا ہے اور انہیں دینی مدارس یا علماء تک رسائی نہیں دی جاتی۔

۲۔ تعلیمی سہولیات کا فقدان :

کئی مقامات پر خواتین کے لیے دینی تعلیم کے ادارے نہیں ہوتے یا وہاں مناسب ماحول میسر نہیں ہوتا۔

۳۔ خود اعتمادی کی کمی :

بعض خواتین خود کو دینی علوم سیکھنے کے قابل نہیں سمجھتیں، جس کی وجہ سے وہ علم حاصل کرنے سے گریز کرتی ہیں۔

خواتین کی دینی علوم سے دوری کے نقصانات :

- خواتین اپنے بچوں کی دینی تربیت درست طریقے سے نہیں کر پاتیں۔
- گھریلو معاملات میں شرعی احکام کی معلومات نا ہونے کی وجہ سے غلطیاں ہوتی ہیں۔
- معاشرے میں دینی بے راہ روی پھیلتی ہے کیونکہ خواتین معاشرے کی

بنیادی تعلیمی اکائی ہیں۔

اس مسئلے کے حل کیلیئے اگر درج ذیل امور پر کام کیا جائے تو ایک حد تک حل ہو سکتا ہے۔
۱۔ خواتین کے لیے دینی مدارس کا قیام: خواتین کے لیے علیحدہ دینی تعلیمی مراکز بنائے جائیں جہاں وہ آرام سے علم حاصل کر سکیں۔

۲۔ گھریلو تعلیم کی ترغیب:

خواتین کیلیئے آن لائن کورسز یا گھر بیٹھے دینی کتابوں سے استفادہ کرانے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

۳۔ معاشرتی بیداری:

لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ دین سیکھنا عورت کا حق بلکہ اس پر لازم ہے اور اس میں کوئی حقوقی، شرعی یا معاشرتی حرج نہیں ہے۔

٤۔ علماء کرام کی رہنمائی:

دینی علماء کو چاہیے کہ وہ خواتین کو دینی تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کریں، ترغیب دیں، بہتر طریقہ و نصاب مہیا کریں، والدین کو سمجھائیں اور اسی طرح علاقائی ذمہ داران کے کانوں تک یہ بات درست طریقے سے پہنچائی جائے۔

دین اسلام نے علم کو مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں اہمیت دی ہے۔ خواتین کی دینی علوم سے دوری درحقیقت معاشرے کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہر سطح پر خواتین کو دینی تعلیم دلوانے کی کوششیں تیز کرنی چاہئیں۔ خواتین اگر دینی علوم سے آراستہ ہوں گی تو ایک نیک، باشعور اور مضبوط نسل کی بنیاد رکھ سکیں گی۔ علم دین عورت کی عزت، عظمت اور کردار کی حفاظت کرتا ہے۔ دینی علم عورت کے کردار کو نکھارتا ہے اور اُسے شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ جب عورت دین پر عمل پیرا ہوتی ہے تو اُس کا اثر اُس کے پورے خاندان پر پڑتا ہے اور وہ گھرانے کو تقویٰ، اخلاص اور نیکی کا گہوارہ بنا دیتی ہے۔ ایسی ماں نسلوں کی کردار سازی کرتی ہے اور معاشرے میں خیر، عدل اور اسلامی اقدار کی روشنی پھیلتی ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ایک اور جان، نام نہاد خود مختاری پر قربان

بنت معراج الدین

ثناء یوسف (میڈیا کے مطابق)ٹک ٹاک پر ویڈیوز بنانے والی ایک نوجوان لڑکی کچھ عرصہ قبل ملکِ پاکستان میں رائج و نافذ نام نہاد خودمختاری کی بھینٹ خوشی خوشی چڑھ گئی اور بے حیائی کے گندے نظام میں ایک اور بلی کا اضافہ کرکے روشن بصیرت رکھنے والوں کے لیے اندھیروں کو مزید واضح کر گئی۔

دورِ جاہلیت میں جب لوگوں کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تھی تو لوگ قبر کھود کر اپنی بیٹی کو زندہ ہی زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے۔ ایسا وہ لوگ اس لیے کیا کرتے تھے تاکہ ان لوگوں کی عزت و ناموس پر بٹہ نہ لگے کیونکہ جاہلیت کی وجہ سے ان لوگوں کے دلوں اور معاشرے میں یہ بات نافذ، رائج اور راسخ ہو گئی تھی کہ بیٹی کی پیدائش باعثِ ننگ و عار ہے لہذا اپنی ننگ و ناموس کی حفاظت کے لیے وہ لوگ اس قدر شقی ہو گئے تھے کہ اپنے لختِ جگر کو زندہ درگور کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے اور (بظاہر) خوشی خوشی یہ کام سرانجام دیا کرتے تھے کیونکہ جو جتنی مستعدی سے ماتھے پر شکن لائے بغیر اور اپنی اندرونی کیفیت کو ظاہر کیے بغیر شقی القلب کا یہ کارنامہ سرانجام دیا کرتا تھا اس کی معاشرے میں اور اپنے حلقہ احباب میں اتنی ہی زیادہ واہ واہ ہوا کرتی تھی اور اس کا ذکر عزت سے کیا جاتا تھا۔

جدید دورِ جاہلیت یعنی موجودہ دور میں بھی کم و بیش قدیم دورِ جاہلیت والا وہی قانون، رسم اور رواج مختلف صورتوں اور طریقوں پر دلوں اور دماغوں اور معاشرے میں نافذ، رائج اور راسخ ہو چکا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم دورِ جاہلیت میں والدین چار و ناچار، طوعاً و کرہاً اپنی بیٹیوں کو انتہائی دکھی اور بھاری دل کے ساتھ زندہ زمین میں دفن کیا کرتے تھے (کیونکہ کس کا دل کرتا ہے اپنی اولاد کو زندہ مار دینے کے لیے یا خود سے جدا کر دینے کے لیے) اور جدید دورِ جاہلیت کے والدین اپنی رضا و رغبت اور خوشی سے یہ کام کرتے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو خودمختاری کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

ثناء یوسف کے ساتھ ہوا یہ کہ یہ بے چاری بچی بہت زیادہ فالتو تھی لہذا اس کے والدین اور متعلقین نے سوچا سمجھا اور بڑے ہی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری فالتو بچی کا اس سے زیادہ اچھا اور صحیح مصرف اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اسے جدید و ذلیل نظام خودمختاری پر صرف کر دیا جائے۔ لہذا ثناء یوسف کو ٹک ٹاکر بنا دیا گیا یا بننے دیا گیا اور وہ نوجوان لڑکی جدید جاہلی دور کے تقاضوں کے عین مطابق نام نہاد خودمختاری پر قربان ہو گئی۔

ملک کے تقریباً تمام ہی معتبر ذرائع ابلاغ کی تفصیل کے مطابق ثناء یوسف کو اس کے گھر میں داخل ہو کر اسی کی قبیل کے ایک ساتھی یعنی ٹک ٹاک پر ویڈیوز بنانے والے لڑکے نے (اسی اعتماد کے ساتھ کہ جس اعتماد کے ساتھ وہ ٹک ٹاک پر ویڈیوز بناتا تھا) فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور وہ بھی مرنے والی لڑکی کی والدہ اور پھپھو کی آنکھوں کے سامنے اور وہ دونوں کھڑی دیکھتی ہی رہ گئیں اور ساتھی لڑکا قاتل آسانی سے فرار ہو گیا۔ پہلے دن تو قاتل کی کوئی تلاش ہوئی نہ ڈھنڈی مچی (ظاہر ہے ٹک ٹاکر کا رسیا پھرتے لا اور اپنے پیروں پر کھڑا "ٹک ٹاکر خودمختار نوجوان تھا لہذا اسے بھی اپنی خودمختاری کو استعمال کرنے کا پورا حق ہے۔) لہذا وہ ٹک ٹاکی نوجوان ٹک ٹاکر کے ساتھ ساتھ ایک قاتل کا اعزاز بھی پا لینے کے بعد 2 یا 3 دن تک آزاد فضاؤں میں موجیں کرتا رہا اور بالآخر پاکستان میں نافذ کامیاب، تیز تر اور عدل انصاف سے بھرپور قانونی نظام کے شکنجے سے بچ نہ پایا اور فیصل آباد سے دھر لیا گیا اور اسے گدی سے پکڑ کر (پلک جھپکتے ہی) اسلام آباد میں لے آیا گیا۔ (اب واللہ اعلم کے وہ لڑکا ہی اصلی اور سچا قاتل ہے یا محض خانہ پوری اور جھوٹی مستعدی جتانے کے لیے اسے گرفتار کیا گیا ہے۔) ویسے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ قاتل نے قتل اسلام آباد میں کیا اور گرفتار فیصل آباد سے ہوا!

قاتل کی گرفتاری کے بعد یہ انکشافات سامنے آئے کہ ٹک ٹاکر قاتل لڑکا کوئی اجنبی نہیں بلکہ لڑکی کا دوست تھا، جی ہاں دوست، (سہیلی نہیں بلکہ بوائے فرینڈ) لڑکا اور لڑکی کی آپس میں دوستی جو کہ اولاً دینِ اسلام میں، دوم ہمارے معاشرے میں اور سوم چترال جیسے خالصتاً سادہ اور فطرت سے زیادہ قربت رکھنے والے علاقے میں کہ جہاں عورتیں تو عورتیں مرد بھی انتہائی شرمیلے اور باحیاء ہوتے ہیں۔ وہی دوستی جو جدید دورِ جاہلیت کی رائج و نافذ نام نہاد خودمختاری کی ایک قبیح زحمت و مصیبت ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے لوگوں نے اس مصیبت کو نعمت سمجھ کر خوشی خوشی قبول کرلیا ہے اور آئے دن ہمارے نوجوان بچے اور بچیاں اس مصیبت کے ہتھے چڑھ رہے ہیں۔

انکشافات بہت ہی زیادہ عجائب و غرائب پر مبنی ہیں، جھوٹ اور سچ کا مرقع بھی ہوسکتے ہیں۔

مقتولہ ٹک ٹاکر کی پھپھو محترمہ کا اس سانحے (نہیں نہیں ویسے سانحہ تو نہیں کہنا چاہیے اس واقعے کو کیونکہ اگر اسے سانحہ کہا گیا تو لبرلز کی توماں مرجائے گی کیونکہ ان کے لیے تو یہ واقعہ جدید دورِ جاہلیت کا حسن ہے، ایک اجنبی نوجوان لڑکے اور لڑکی کے لیے خودمختاری کے حصول کے لیے کامیابی کا ایک زینہ طے کرنے کے مترادف ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کامیابی کے حصول کے لیے دونوں کی عزت، آبرو، ناموس، حسب، نسب اور وقار داؤ پر لگ گیا اور ایک کی جان چلی گئی اور دوسرا جاں بہ لب ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ عزت کا کیا ہے؟ بس خودمختاری حاصل ہونی چاہیے۔) کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہنا ہے کہ وہ اس وقت گھر پر ہی موجود تھیں اور ان کے علاوہ گھر کے باقی لوگ موجود نہیں تھے۔ مقتولہ (بھتیجی) بیٹھک میں (قاتل کے ساتھ موجود تھی اور دونوں میں بحث جاری تھی اور لڑکا بہت زیادہ شکوہ کناں تھا لڑکی سے کہ تم نے مجھے بہت زیادہ نظر انداز کیا ہے اور اسی طرح کی باتوں کے دوران لڑکا بہت زیادہ غصے میں آگیا تو لڑکی نے کہا کہ میں تمہارے لیے (ٹھنڈا) پانی لے کر آتی ہوں۔ پھپھو صاحبہ کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن رہی تھیں۔

پھپھو جانی کے یہ اعترافات ہمارے معاشرے میں تیزی سے پھیلنے والی بے حیائی کا کھلا عکاس ہے. جس کو روشن خیالی اور ترقی کا نام دیا جاتا ہے اس موجودہ "جدید دورِ جاہلیت میں۔ اب اس گھر کے ماحول کا اندازہ لگالیں کہ کیسا آزادانہ اور آوارانہ ماحول ہوگا اس گھر کا کہ جہاں پھپھو کی موجودگی میں ایک غیر مرد اس کی بھتیجی سے راز و نیاز کی باتیں باآواز بلند کر رہا ہو۔

اعترافات ہی کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو مقتولہ کا باپ بالکل ایسی باتیں کر رہا ہے بے چارہ کہ جن سے صاف نظر آ رہا ہے کہ ان کی مقتولہ بیٹی واقعتاً خودمختاری کے حصول کی تمام رکاوٹوں کو پار کرکے خودمختاری کی ڈگری اے ون گریڈ میں حاصل کرچکی تھی کیونکہ دکھی اور غم سے نڈھال باپ کا میڈیا اور پولیس کو یہ کہنا ہے کہ ان کی کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی (مگر بیچارے کی خود اپنی ذات سے بڑی گہری دشمنی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو نام نہاد خودمختاری کے حصول کے لیے آپ ہودری (صرف اپنی مرضی کرنے والی سرکش عورت) بنا دیا۔) اباجان بیچارے اپنی دھی رانی (لاڈلی بیٹی) کی سرگرمیوں سے بالکل ناواقف دکھائی دیے۔

اسلام آباد کے آئی جی سید علی ناصر رضوی نے اسلام آباد کی پولیس انتظامیہ کے ہمراہ پریس کانفرنس کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری تفتیش کے دوران لڑکے نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے لڑکی کو اس لیے قتل کیا کہ لڑکی نے اسے بارہا نظرانداز کیا۔ 2 جون کے دن بھی قاتل سات آٹھ گھنٹے تک مقتولہ کے گھر کے باہر اس سے ملنے کے لیے انتظار کرتا رہا اور اس سے رابطہ کر کر کے بار بار اس کی منت ترلے کرتا رہا کہ مجھ سے مل لو مگر وہ نہیں مانی لہذا اس رویے کی وجہ سے میں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ لیں جی بات ہی ختم ایک طرف لڑکی نے اپنی خودمختاری کو استعمال کرتے ہوئے، والدین، رشتہ داروں کی عزت کو خاک میں ملانے کے ساتھ ساتھ عشق نام دار کے دعوے داروں کو ایک ہی لائن میں کھڑا کردیا تو دوسری طرف اسی نام نہاد خودمختاری کے حصول میں اپنی جان تک کی بھی بازی لگا دی۔

یہ تھی جدید دورِ جاہلیت میں کسی سرکش و بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتی ہوئی نام نہاد خودمختاری کی اصل حقیقت جو کہ بہت ہی زیادہ بھیانک ہے۔

اس نام نہاد خودمختاری کو میری طرف سے "سو چھتر تے حقے دا پانیں"

(سوجوتوں کے ساتھ ساتھ حقے کا پانی بطور تحفہ)

لگے ہاتھوں ملکِ خدا داد میں نام نہاد خودمختاری کا زہر بیچنے اور اس کا زہریلا درس پڑھانے اور اس پر عمل کرنے والے سول سوسائٹی کے تمام لوگوں کو مشورہ ہے کہ حالیہ مقتولہ ٹک ٹاکر کے ایصالِ ثواب کے لیے اس کے والدین، اس کے رشتہ داروں اور اس کے دل جلے، زخمی عاشقِ نامدار کا کانی قاتل کو اور اگلے پچھلے تمام بہی خواہ کے ساتھ مل کر پریس کانفرنسوں کے ساتھ ساتھ پورے ملک کے چوکوں چوراہوں پر جلسے جلوس اور ریلیوں کا انعقاد کریں اور ان تمام مجمعوں میں نام نہاد خودمختاری کے حصول میں کامیاب ہو کر اپنی جان کی قربانی دینے والی بہت سی شخصیات مثلاً نور مقدم اور اس کے معشوق نامدار ظاہر جعفر، قندیل بلوچ، تھل کی رانی اقراء، اور ان گنت نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان تمام کے لیے افسوس، تعزیت یا نوحے اور گریہ وزاری یا احتجاجات مت کریں بلکہ، شادیانے بجائیں، بھنگڑے، لڈیاں، جھومر، اٹانڑں کریں یا کوئی بھی جدید انگریزی یا یورپی ناچ، ناچ لیں کیونکہ ان تمام کو تو فخر ہونا چاہیے ان تمام پر کہ یہ تو نام نہاد خودمختاری کے حصول میں کامیاب شخصیات ہیں۔ ان کے لیے افسوس کیسا اور کیوں؟۔

جہاد سے روگردانی

سیف حاد

آج ہم ایک ایسے زمانے کا حصہ ہیں جہاں عالم اسلام کے بیشتر حصے مقبوضہ ہیں، لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں : "ربنا لم کتبت علینا القتال" (اے اللہ! ہم پر قتال کیوں فرض کیا گیا؟) (سورۃ النساء : 77)۔ آج کا مسلمان کہتا ہے : "نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ" (ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں) (المائدہ : 52)۔

ہر طبقہ آزادی تو چاہتا ہے، مگر جدوجہد اور قتال سے منہ موڑتا ہے۔ تاہم، کہیں نہ کہیں مسلمانوں کے دلوں میں جہاد کی عظمت ضرور موجود ہے۔ برما ہو، کشمیر ہو، فلسطین ہو یا شام، مجاہدین کی عظمت و رفعت ہر جگہ کسی نہ کسی گوشے میں نظر آتی ہے۔ عالم اسلام کے ہر جہاد کو شرعاً علماء نے ایک مقام دیا، لیکن ایک جہاد کو لاوارث چھوڑ دیا گیا۔ ایک خطہ زمین، جہاں فساد زور و شور سے جاری ہے، اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ وہ جہاد ہے "جہادِ پاکستان"۔ جس طرح بنی اسرائیل کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بٹھائی گئی تھی : "وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ" (ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بٹھائی گئی) (البقرہ : 93)، اسی طرح یومِ اول سے ہمارے دلوں میں وطنِ پاکستان کی محبت پیوست کر دی گئی۔ کفریہ آئین کے باوجود ہمیں یہ باور کروایا گیا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ اس ظالم ریاست کی اسلام دشمن فوج کو، اس کے تمام جرائم اور معصیت کے باوجود، "پاک فوج" کا نام دیا گیا۔ ہر قسم کی بداعمالیوں کو اس طرح سجایا گیا کہ ہم نے ان برائیوں میں اسلام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ہم سے ہر روز یہ نعرہ لگوایا جاتا ہے کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا إلہ إلا اللہ"، لیکن اس نعرے کی حقیقت کبھی سمجھائی نہ گئی۔ اگرچند خوش نصیبوں نے اسے سمجھا اور اللہ کے نظام کا مطالبہ کیا، تو انہیں دہشت گرد قرار دیا گیا۔ انہیں گرفتار کیا گیا، ان کی ماؤں اور بہنوں کی عزتوں کو پامال کیا گیا۔ کئی سالوں سے امت کے یہ چراغ نہ جانے کہاں گم ہو گئے؛ معلوم نہیں کہ وہ زمین میں دفن ہیں یا آسمان کی ہوا کے ذرات میں مل گئے۔ افسوس کہ ہمارے وہ علماء، جنہیں ہم نے اپنے سروں کا تاج سمجھا، یہ کہہ اٹھے کہ ریاست کے خلاف تلوار اٹھانا جرم ہے۔ جن علماء کو ہم نے اپنا امیر مانا، وہ کہتے ہیں کہ یہ جہاد نہیں، فساد ہے۔ ارے! ہمارے سوالوں کا جواب دو : جب ریاست ہی کفریہ دفعات پر مبنی ہو، تو ہم کیا کریں؟ جب ریاست سرعام ہم پر گولہ بارود برسائے، تو ہم کیا کریں؟ جب ریاست ہمارے گھروں کو مسمار کرے، تو ہم کیا کریں؟ جب ریاست مساجد منہدم کرے، تو ہم کیا کریں؟ اگر ان سب کے باوجود ہمیں ہتھیار اٹھانے سے منع کیا جاتا ہے، تو کس بنیاد پر کیا جاتا ہے؟ پاکستانی فوج، جو 800 عرب و غیر عرب مجاہدین کو امریکہ کے حوالے کرنے کی مجرم تھی، آج بھی ہزاروں مجاہدین کو عقوبت خانوں میں ڈالنے اور گھروں پر بم برسا کر ماؤں کو رلانے کی مجرم ہے۔ امت کی کتنی بیٹیاں ان اداروں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں؟ مائیں روز اپنے لختِ جگر کا دروازے پر انتظار کرتی ہیں اور اسی غم میں گھلتی جاتی ہیں۔ کتنے ورثۃ الانبیاء انہی اداروں کے ہاتھوں بے دردی سے شہید کیے گئے؟ کوئی تراویح میں شہید ہوا، تو کوئی درس کے دوران۔ آج تک ان کا قصاص ہماری گردنوں پر لازم ہے۔ کتنے بے گناہ شہری قتل کیے گئے، جن کا قصاص ہم پر واجب ہے؟ کیا ان سب کے باوجود ہم ریاست کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں؟ اس پر یہ شعر خوب جچتا ہے :

ظلم دیکھتے نہیں یہ زمانے والے
پھر کہتے ہیں فوج سے جہاد کیسا
پڑھتے نہیں وہ درد کی داستان
پھر کہتے ہیں یہ ملک دغا کیسا
کہتے ہیں محافظ ہے ہماری یہ کھڑی سرحد پر خاکی وردی

میرا ان سے سوال ہے اگر یہ بات سچ ہے تو

پھر ان کی وجہ سے ہر گھر میں زوال کیسا؟ آج اس اسلامی جمہوریہ میں نہ مسجدیں محفوظ ہیں، نہ مدرسے، نہ معلم، نہ متعلم، نہ قرآن، نہ حدیث، نہ اسلام، نہ مسلمان۔ نہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناموس کی حفاظت ہو سکی، نہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عزت کا دفاع ہوا، نہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دشمنوں کو سزا دی گئی، نہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اٹھنے والی طعن و تشنیع کا جواب دیا گیا۔ پاکستان آج ایک ایسے موڑ پر ہے کہ اس غیر اسلامی نظام پر چلنا بلکل واضح ہو چکا ہے۔ وزیرستان کے حالات ناقابل بیان ہیں۔ بلوچستان برسوں سے بدامنی کا شکار ہے۔ وہاں کی نسلوں نے اپنوں کی گرفتاریاں دیکھیں۔ آج وہ بچے، جو بڑے ہوئے، اپنے حقوق کی آواز اٹھاتے ہیں، مگر انہیں ہر جگہ دہشت گرد بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ہسپتال جائیں، تو جگہ نہیں ملتی؛ یونیورسٹی جائیں، تو اس بنا پر داخلہ نہیں ملتا کہ وہ بلوچ ہیں۔ حال ہی میں باجوڑ میں شہید ہونے والے بچوں کو دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک عزیز سہیلی کو جب یہ خبر تصاویر کے ساتھ بھیجی، تو ان کا جواب عجیب تھا: "غزہ کو دیکھو، وہ اس سے بھی بدتر حال میں ہے۔" ہائے! اہلِ غزہ اور ان کے ایمان واستقامت پر قربان جاؤں، مگر کیا اپنے گھر میں لگی آگ نہیں دکھتی؟ فلسطین اور پاکستان کے حالات میں شاید صرف یہ فرق ہے کہ ہمارے چند علاقے ابھی کچھ محفوظ ہیں، کیونکہ ہمارے بڑوں نے طاغوتی نظام کے سامنے سر جھکا دیا۔ آج بلوچستان کا ذکر چھیڑو، تو اکثریت کو معلوم ہی نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، کیونکہ ہم اپنے ملک کے حالات سے اتنے واقف نہیں جتنے کافروں سے ہیں۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، وہ پاکستان نیوز کی بدولت غلط خبریں ہیں۔ اہلِ حق کو ناحق اور علمدارِ خلافت کو دہشت گرد بتایا گیا۔ اس جہاد سے بے رخی ہماری اکثریت میں پائی جاتی ہے۔ کچھ ماہ قبل پاکستان کی فضائی کارروائی، جو افغان صوبے پکتیکا میں کی گئی، اس میں کتنے معصوم بچے شہید ہوئے؟ کتنے زخمی ملبے پر بیٹھے تھے؟ ہائے اے افغان! اے سرزمینِ عمرِ ثالث! اے ارضِ شہداء! ہم شرمندہ ہیں۔ بحیثیت شہری، میں اس کشمکش میں ہوں کہ ہمارے علماء، جو دن رات اسرائیل کو بددعا دیتے ہیں، کیا انہیں اپنے گھر کی آگ نہیں دکھتی؟ کیوں وہ ممبر پر کھڑے ہو کر یہ نہیں کہتے کہ اس طاغوتی نظام سے بغاوت کرو؟ وہ دعاؤں میں اسرائیل کی تباہی مانگتے ہیں، مگر پاکستان میں امن کیوں نہیں مانگتے؟ کیا ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا؟ کیا عقلیں مفلوج ہو گئیں؟ کیا انہیں یاد نہیں کہ من حیث الادارہ کس نے لال مسجد کو خون میں نہلایا؟ کس نے جامعہ حفصہ کی طالبات کی لاشیں بچھائیں؟ کیا تم 2007 کے واقعات بھول گئے؟ کیا تمہارے زخم بھر گئے؟ حال ہی میں جب ام حسان صاحبہ کو گرفتار کیا گیا، تو دینِ اسلام کے دعویدار کہاں تھے؟ جب ان کا اور ان کی طالبات کا برقع پھاڑا گیا، تو تمہاری غیرت کہاں تھی؟ جواب دو کہ ام حسان صاحبہ کس کے گھر کو بچانے نکلی تھیں؟ کیا وہ ان کا اپنا گھر تھا؟ کیا اس میں ان کا کوئی مفاد تھا؟ وہ تو خدا کا گھر تھا! اس وقت وہ سارے لوگ کہاں تھے جو مساجد کی حفاظت کا ٹھیکہ لیتے ہیں؟ میرا ان سے سوال ہے جو دفاعِ اہلِ سنت کی مہم چلاتے ہیں: جب پاڑاچنار میں اہلِ سنت کی لاشیں گرائی جا رہی تھیں، تم کہاں تھے؟ جب بکن بازار میں قرآن کو جلایا گیا، تو دینِ اسلام کے پہریدار کہاں تھے؟ آج اس اسلامی ملک میں شیعوں کو اتنی چھوٹ کیسے؟ ہر سرکاری ادارے میں ختمِ نبوت کے بدترین دشمن، روافض و قادیانی کیوں موجود ہیں؟ محسن نقوی، شیعہ ملعون، کون ہوتا ہے اس اسلامی ملک میں مساجد کے معاملات دیکھنے والا؟ عورت مارچ کے نام پر شریعتِ محمدیہ کی توہین کا کیا جواب ہے؟ لواطت کو فروغ دیا جا رہا ہے، نائٹ کلبوں کے نام پر زنا کے اڈے کھولے جا رہے ہیں۔ اب بھی تم کہاں ہو؟ ٹٹولو خود کو کہ تم کس مقام پر ہو! میرے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ سود مجھ سے اعلانِ جنگ ہے۔ آج پورا ملک سود پر چل رہا ہے۔ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود اپنے دفاع کے لیے امریکہ کی اجازت کا محتاج ہے۔ پاکستانی پاسپورٹ پر لکھا ہے کہ اسرائیل جانے کی ممانعت ہے، مگر یہ حکومت اور فوج اسرائیل کے پالتو کتے ہیں۔ خفیہ دورے اسرائیل کی طرف کیے جا رہے ہیں، اس کی شاباش مل رہی ہے۔ اس ملک میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی گستاخی کی جاتی ہے، جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔" آج ان ستاروں پر تبرہ کیا جاتا ہے، ایسے کلمات اعلانیہ کہے جاتے ہیں کہ سوچ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ کیا یہ اسلامی ملک ہے؟ اس کا جواب روزِ روشن کی طرح واضح ہے: نہیں، یہ اسلامی ملک نہیں! یہ امریکہ کے ایجنڈوں کا ملک ہے، اسرائیل کے غلاموں کا ملک ہے، دین فروشوں کا ملک ہے۔ یہ اس قوم کا ملک ہے جو اپنے حقوق کے علاوہ دنیا کے سب لوگوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہے۔ الغرض، ان سب وجوہات کے باوجود اگر یہ جہاد اور غمِ پاکستان سمجھ نہ آئے، تو تمہاری سوچ کو علاج کی ضرورت ہے، تمہاری عقل مفلوج ہو چکی ہے۔

جہاد میں خواتین کا کردار

ام دانیال

اکثر سمجھا جاتا ہے کہ جہاد صرف مردوں کا کام ہے، جبکہ تاریخِ اسلام ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ عورتوں نے بھی جہاد کے میدان میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے چاہے وہ جسمانی ہو، ذہنی ہو، اخلاقی ہو یا روحانی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم مردوں کو دیا، جیسے "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (البقرة، ٢٨٦)، کیونکہ عورت فطرتاً نرمی، حیا، اور پردے کی علامت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورت جہاد سے خارج ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہارا حج ہی تمہارا جہاد ہے" (بخاری)، یعنی عورت کی فطری ذمہ داریاں ہی اس کے لیے جہاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاریخِ اسلام میں ایسی کی مثالیں موجود ہیں جو جہاد میں خواتین کے عظیم کردار کی روشن مثالیں ہیں۔

نُسیبہ بنت کعب (ام عمارۃ):

غزوہ اُحد میں آپ نے تلوار لے کر نبی کریم ﷺ کی حفاظت کی، شدید زخمی ہوئیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جدھر بھی دیکھتا، ام عمارہ کو لڑتے پاتا۔"

رفیدۃ اسلمیۃ:

آپ صحابہ کرام کے زخموں کا علاج کرتی تھیں۔ جنگ میں سب سے پہلا فیلڈ ہسپتال انہوں نے ہی قائم کیا۔

ام سُلیم:

آپ جنگوں میں پانی پلاتیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، اور انہیں حوصلہ دیتیں۔ ان کے صاحبزادے انس بن مالک، خادمِ رسول ﷺ تھے، یہ ان کی تربیت کا اثر تھا۔

ام حکیم، صفیہ بنت عبدالمطلب، اور دیگر صحابیات نے بھی نظریاتی اور عملی طور پر جہاد میں شرکت کی۔

ان سب بہادر اور معاملہ فہم صحابیات کی پیروی کرتے ہوئے آج کی مسلمان عورت کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق جہاد کا بھرپور حق ادا کرنے کی کوشش کرے جس کے کچھ طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔

- بچوں کی اسلامی تربیت
- پردہ اور حیا کی حفاظت
- علم دین سیکھنا و سکھانا
- سوشل میڈیا پر دین کا دفاع
- بے حیائی، الحاد، فتنوں کے خلاف فکری و علمی جہاد
- دعاؤں اور صبر کے ذریعے مجاہدین کی پشت پناہی

عورت چاہے میدان جنگ میں نہ بھی ہو، مگر اس کا قلم، دعا، تربیت، حوصلہ، اور علم جہاد میں مردوں سے کم نہیں۔

آج کی مسلم خاتون اگر ام عمارہ، ام سلیم، اور رفیدہ کو رول ماڈل بنائے تو معاشرہ ایک بار پھر روشنی کی طرف لوٹ سکتا ہے۔

اللہ ہمیں حق پر ڈٹ جانے، صبر و حیا کے ساتھ دین کی خدمت کرنے، اور اپنی نسلوں کو جہادِ فکر و تربیت کے لیے تیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نسل کی تعمیر میں خواتین کا کردار

ام ایوب

نسل نو کی نشوونما میں عورت کا کردار بمثل معمار ہے۔ جس طرح ایک معمار اینٹیں جوڑ جوڑ کر اپنے ہنر سے عمارتیں کھڑی کرتا ہے ویسے ہی عورت بچوں کی اچھی تربیت کرکے معاشرے کو نیک سیرت اور کار آمد افراد مہیا کرتی ہے۔ اگر معمار اپنے فرض سے کوتاہی برتے تو اس کی بنائی ہوئی عمارتیں ناقص اور ناپائیدار ہونگی۔ اسی طرح اگر عورتیں بچوں کی تربیت سے سبکدوش ہوجائیں تو معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہوجائے گا۔

بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ حدیث مبارک میں ارشاد ہے کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور پھر اسکے والدین اسے یہودی و نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

بچوں کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔

کہتے ہیں کہ پانچ سال کی عمر بچے کی سیکھنے کی ہوتی ہے۔ لیکن نہیں، بچے کی تربیت تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک والدین نے یہ طے کیا کہ امید کے دنوں میں کوئی گناہ نہیں کریں گے تاکہ بچے پر غلط اثر مرتب نہ ہو۔ بچہ پیدا ہوا۔ اسکے بعد بھی اسکی نگرانی کی گئی۔ ایک دن دیکھا کہ اس نے پڑوس کی کھجور اٹھا کر چپ چاپ کھا لی۔ اسکو دیکھ کر والدین کو بہت افسوس ہوا۔ آخر کار بات یہ کھلی کہ امید کے دنوں میں ایک دن اسکی ماں کو سخت بھوک لگ رہی تھی اور کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے پڑوس کے گھر کے درخت کی شاخ جو اسکے گھر آئی ہوئی تھی اس میں سے ایک کھجور چپ چاپ کھا لی تھی جس کا اثر بعد میں بچے پر بھی ہوا۔ (مقالات غزالی)

حضرت رشید احمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے عید کے دن دیکھا کہ عید گاہ میں ایک سیٹھ آیا اور اس نے کپڑے بدل کر خود عید گاہ کی صفائی شروع کردی۔ میں بہت حیران ہوا کہ اتنا بڑا سیٹھ ہے، ظاہری شکل یہ ہے کہ کلین شیو ہے۔ بعد میں پتہ چلا بچپن میں اس کی تربیت تھانہ بھون میں ہوئی تھی۔ اسی کا یہ اثر ہے۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور انکی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کی حفاظت اس قدر ضروری ہے کہ اتنی اور کوئی چیز ضروری نہیں جس وجہ سے مسلمان عورت (ماں) اپنے بچے کی تعلیم و تربیت میں دن رات مشغول رہتی ہے۔

وہ اس لئے بچوں کی تربیت نہیں کرتی کہ بچہ بڑھاپے میں ان کے کام آسکے گا بلکہ انکی تربیت اور انکی محبت وشفقت کا مقصد ہی صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ بچے قوم کی امانت ہیں اور انکی صحیح تربیت کرکے قوم کے سپرد کرنا ہے۔

اللهم انى اسئلك من صالح ماتوتى الناس من المال والاهل والولد غير ضال ولا مضل

اے اللہ! میں تجھ سے اچھی چیز کا سوال کرتا ہوں جو تو لوگوں کو دے، مال ہو یا بیوی یا اولاد۔ کہ نہ گمراہ ہوں اور نہ گمراہ کرنے والے۔ وہ گود جہاں بچے نے عقیدہ و ایمانیات سیکھنی تھی، وہاں بچہ کیا سیکھتا ہے۔ سیکھے گا تو تب ہی جب ماں بچے کے لئے فارغ ہو گئی اور عقیدہ و ایمانیات کو جانتی ہو گئی۔

ماں باپ دونوں دن رات کمانے میں لگے ہیں۔ بچوں کا مستقبل سنوارنے میں لگے ہیں۔ نہیں فکر تو انکی آخرت کی نہیں فکر۔ نہیں فکر تو

انکی دین سے دوری میں تباہی کی نہیں فکر۔

آجکل جیسا لائف سٹائل لوگوں نے اپنا رکھا ہے اس میں لوگ اپنے دین سے نہیں بلکہ ضروریات دین سے ہی بے خبر ہیں۔ بچہ تو تب سیکھے گا جب ماں کا دل اللہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہوگا۔ جب امت مسلمہ کا غم اس کے دل میں بسا ہوگا۔ جب وہ اپنے بچے کو ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ بنانے کے خوابوں کے ساتھ امت مسلمہ کا خادم مجاہد بنانے کی لگن رکھتی ہوگی۔ جب اسکا عقیدہ ہوگا کہ موت برحق ہے اور اسکا وقت بھی مقرر ہے۔ اپنے وقت سے موت آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ نہ جہاد عمر کو کم کرتا ہے اور نہ ترک جہاد عمر کو بڑھاتا ہے۔

اس عقیدہ کے ساتھ بچے کی کی گئی تربیت اور مغرب سے متاثر شدہ ماں کی تربیت میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔ مغرب سے متاثرہ ماں اپنے بچے کی تربیت اسی مغربی طرز پر کرے گی جو سراسر جہالت کا ڈھیر ہے۔ وہی مغربی لباس وہی مغربی طرز زندگی وہی دنیا کو ہی سب کچھ سمجھنا۔۔۔ایسے میں آخر کیونکر امید لگائی جاسکتی ہے کہ بچہ بڑا ہو کر قبلہ اول کی آزادی کی جنگ میں شامل ہوں گا جبکہ اس کے دل و دماغ میں سوائے دنیا کے کچھ ہوگا ہی نہیں۔

آج کے دور میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر کے اندر ماں کی گود میں وہ بمشکل چار سال ہی گزار پاتا ہے۔ کہیں کہیں پر تو ماں باپ مہنگی فیسوں کے عوض بچوں کو تین سال کی عمر میں ہی سکول چھوڑ آتے ہیں۔ وجوہات یہی ہیں کہ کبھی تو انکے پاس اپنے بچوں کی پرورش کے لیے وقت نہیں ہوتا اور کبھی وہ معیاری و مثالی تعلیم و تربیت کے نام پر ایسا ظلم کر گزرتے ہیں۔ پھر ان سکولوں کا نصاب بھی یہود و نصاریٰ کی طرف سے منتخب شدہ! یوں سمجھ لیجیے کہ پیسوں کے عوض بچوں کو یہود و نصاریٰ ہی کے مکتب میں پھینک دیا جہاں پر انکی شخصیت کی بنیاد دین بیزاری اور مادیت پسندی پر ہوتی ہے۔

لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت

حضرت انسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ كُنَّ له ثلاثُ بناتٍ، أو ثلاثُ أخواتٍ فَاتَّقَى اللّٰهَ فيهنَ، وأقامَ عليهنّ، كانّ في الجنةِ مَعِي هكذا، وَأَوْمَأَ بالسَبَّاحّةِ وَالْوُسطىٰ۔

(مسند ابو یعلی ۱/ ۱۷۰

یعنی جس کی تین لڑکیاں یا تین بہنیں ہوں، پس وہ ان کے حقوق کے بارے میں اللہ سے ڈرا اور ان کی پرورش کی تو وہ جنت میں اس طرح رہے گا اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے شہادت اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا۔ یعنی قرب اور اتصال کو ظاہر کرنے کے لیے انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب اور متصل ہیں اسی طرح وہ شخص اور میں جنت میں قریب ہوں گے۔